عظمت صحابہ

عظمتِ صحابہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن میں خیر امت (آل عمران ۱۱۰) کہا گیا ہے۔ انبیاء و رسل کے بعد وہ تمام انسانوں میں سب سے بہتر گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں (هم خير اجيال البشرية خلا الانبياء والمرسلين)

صحابہ یا اصحاب رسول کی یہ غیر معمولی عظمت کیوں ہے۔ یہ کوئی پر اسرار کرامت کی بات نہیں، یہ ایک معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قول و عمل سے تاریخ میں ایسی مثال قائم کی جیسی مثال کبھی کسی انسانی گروہ نے قائم نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اعلیٰ اور افضل گروہ قرار پائے۔

ان کا سب سے پہلا اور انوکھا کارنامہ وہ ہے جس کو معرفتِ حق کہا جاسکتا ہے۔ لوگ سچائی کے مظاہر کو جانتے ہیں، صحابہ نے سچائی کو حقیقت کے اعتبار سے جانا۔ لوگ مانی ہوئی سچائی کو مانتے ہیں، انھوں نے سچائی کو خود اپنی بصیرت سے دریافت کیا۔ لوگ اس سچائی کی قدردانی کرتے ہیں جو گنبد کی سطح پر نظر آتی ہو، انھوں نے اس سچائی کی قدر کی جو ابھی صرف مجرد روپ میں تھی۔

لوگ اس سچائی کے چیمپین بنتے ہیں جس کے ساتھ مادی وزن اکٹھا ہو گیا ہو، انھوں نے اپنے آپ کو اس سچائی کے لیے وقف کیا جو ہر قسم کے مادی وزن سے یکسر خالی تھی۔ لوگ اس سچائی کی علم برداری کرتے ہیں جس کی پشت پر ایک باعظمت تاریخ بن چکی ہو، انھوں نے ایک بے تاریخ سچائی کا ساتھ دیا اور ہر قسم کی نفسیاتی اور جسمانی قربانی دے کر خود اس کی ایک شاندار تاریخ بنائی۔

اصحاب رسول تمام انسانی نسلوں کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے اپنے بندوں کے لیے ایک نمونہ قائم کرے۔ اصحاب رسول نے اپنی غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ یہ درجہ حاصل کیا کہ وہ تمام انسانیت کے لیے ابدی نمونۂ حیات قرار پائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے ہر مرحلہ میں حق پر ثابت قدم رہے۔ جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں وہی روش اختیار کی جو انصاف اور صداقت پر مبنی تھی۔ وہ آزاد ہوتے ہوئے اصولوں

کے پابند بن گئے۔ اختیار رکھتے ہوئے انھوں نے سچائی کے سامنے اپنے کو بے اختیار کرلیا۔ ان کے لیے بے راہ روی کے مواقع موجود تھے مگر وہ بے راہ رو نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہر معاملہ میں اپنے آپ کو راست روی کے اعلیٰ معیار پر پوری طرح قائم رکھا۔

پوری انسانی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی پیغمبر کو اس کے ہم عصر لوگوں نے پہچانا ہو۔ پچھلے پیغمبروں کو افراد ملے مگر انھیں جماعتیں نہ مل سکیں۔ اصحاب رسول کا یہ انوکھا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جماعت کی سطح پر اپنے ہم عصر پیغمبر کو پہچانا اور بڑی تعداد میں اس کے مشن کو اپنا کر اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ان کے ساتھ بار بار وہ واقعات پیش آئے جن کو عذر بنا کر لوگ بدک جاتے ہیں اور ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، مگر انھوں نے کسی عذر کو عذر نہیں بنایا، وہ ہر قسم کی ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کی حمایت کرتے رہے، یہاں تک کہ اسی حال میں اس دنیا سے چلے گئے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کی حیثیت سے مبعوث کیا تھا۔ یہ سادہ طور پر صرف تقرر کا معاملہ نہ تھا، بلکہ ایک مشکل ترین منصوبہ کو بر روئے کار لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک وسیع الاثر انقلاب برپا کر کے وہ تاریخی اسباب ظہور میں لائے جائیں جس کے بعد آپ کی نبوت ہمیشہ کے لیے ایک مسلّم نبوت کی حیثیت اختیار کرلے۔ آپ کا دین ناقابل شکست حد تک ایک محفوظ دین بن جائے۔ آپ کی ذات اور آپ کا کارنامہ تاریخ میں اس طرح ثبت ہو جائے کہ کوئی مٹانے والا اس کو مٹانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ منصوبہ اسباب کی دنیا میں اور انسانی آزادی کے ماحول میں مکمل کرنا تھا۔ اس پہلو نے اس منصوبہ کو آخری حد تک ایک انتہائی مشکل منصوبہ بنا دیا۔ اصحاب رسول نے اپنے آپ کو پوری طرح اس منصوبہ الٰہی میں شامل کیا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنی جان کو جان اور اپنے مال کو مال نہیں سمجھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی انا کو کچلا۔ اپنے تاج کو اپنے پیروں کے نیچے روندا۔ اپنی محبوب چیزوں کو چھوڑ کر وہ اس کی طرف بڑھے۔ انھوں نے نہ ماننے والی بات کو مانا۔ انھوں نے ناقابل برداشت کو برداشت کیا۔ پیغمبر کو پانے کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ کسی بھی شرط اور کسی بھی تحفظ کے بغیر وہ آپ کے شریک کار بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول انسانی تاریخ کے ایک منفرد گروہ تھے۔ اصحاب رسول کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کوئی شخص اس کو لفظوں میں بیان کر سکے۔

فطری اوصاف

ابتدائی دور کے سماج (primitive society) کے بارہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو مطالعہ کیا گیا، اس میں یہ مان لیا گیا تھا کہ یہ لوگ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے کمتر (mentally and morally inferior) تھے۔ مگر بیسویں صدی میں علم الانسان (Anthropology) کے علماء نے جو تحقیقات کی ہیں، اس کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان نہایت اعلیٰ انسان تھا۔ تہذیبی ساز و سامان میں بظاہر وہ پیچھے تھا۔ مگر انسانی اوصاف کے اعتبار سے وہ معیاری انسان کی حیثیت رکھتا تھا۔ (VII/382)

اس جدید تحقیق کے بعد سماجیات میں ایک نیا شعبۂ فن وجود میں آیا ہے جس کو پریمیٹوزم (Primitivism) کہا جاتا ہے۔ اس فن میں ابتدائی دور کے انسان کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صفات کے اعتبار سے آئیڈیل انسان تھا اور آج کے انسان کو اسی کی پیروی کرنا چاہیے (VIII/212)

یہ نظریہ اسلام کے تصور تاریخ کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ابتدائی دور کے لوگ امت واحدہ تھے (البقرہ ۲۱۳) یعنی وہ اس واحد صحیح راستہ پر تھے جو خدا نے ان کے لیے انسانِ اوّل (آدم) کی پیدائش کے وقت مقرر کر دیا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ اس راستہ سے ہٹ گیے۔ ان میں بگاڑ اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب انسانی آبادی پر بگاڑ کا دور شروع ہوا تو خدا نے پیغمبر بھیجنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

ابتدائی دور کا انسان صحیح کیوں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطرت پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو فطرت بنائی ہے، وہ انتہائی معیاری صفات کی حامل ہے۔ جب تک آدمی اپنی اس پیدائشی فطرت پر تھا، وہ اعلیٰ انسانی صفات سے متصف تھا، اس کے بعد تمدن کا دور شروع ہوا۔ اس مصنوعی تمدن نے انسان کو بگاڑنا شروع کیا۔ اب انسان کی فطرت دب گئی اور اس پر مصنوعی تمدنی صفات غالب آگئیں۔

فطرت کا یہی بگاڑ ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے دور میں آنے والے پیغمبروں کا انکار کیا جاتا رہا۔

اس بگاڑ کی بنا پر انسانی فطرت اور دینِ خداوندی میں مطابقت باقی نہ رہی۔ انسان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی وجہ سے پیغمبروں کو پہچاننے اور ان کی آواز پر لبیک کہنے والا نہ بن سکا۔ یہ صورت حال ہزاروں سال تک جاری رہی۔

حضرت ابراہیم کا پیغام جب اہل عراق کو متاثر نہ کرسکا تو انسان کی نا اہلی آخری طور پر واضح ہوگئی۔ اب اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ منصوبہ بندی کی گئی کہ انسان کو دوبارہ غیر تمدنی دنیا کی طرف واپس لے جایا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق، حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا گیا جہاں اس وقت صرف فطرت کا ماحول تھا۔ فطرت کے مناظر کے سوا وہاں کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔

اس صحرائی ماحول میں ایک ایسی نسل کی تیاری شروع ہوئی جو تمدن سے مکمل طور پر منقطع ہو کر پرورش پاسکے۔ توالد و تناسل کے ذریعہ یہ نسل بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ڈھائی ہزار سال میں ایک نئی قوم بن کر تیار ہوگئی۔ اس نئی قوم کے ہر فرد میں وہ اعلیٰ فطری اوصاف پوری طرح موجود تھے جو ابتدائی دور کے انسان میں پائے جاتے تھے۔ یہی فطری یا انسانی اوصاف اس صحرائی قوم کی شناخت بن گیے۔

قدیم عربوں میں اعلیٰ انسانیت کو بتانے کے لیے کچھ الفاظ رائج تھے۔ مثلاً الفتوۃ، المروءۃ، الرجولیۃ، وغیرہ۔ اردو میں اس کو جواں مردی یا مردانگی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے عربوں کی مراد عین وہی چیز ہوتی تھی جس کو آج "ابتدائی انسانی اوصاف" کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنو اسماعیل کی یہ صحرائی قوم قدیم ابتدائی سماج کا ایک احیاء تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے "معادن عرب" کے بارہ میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہوں گے (خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام) دور اول کے عرب اہل اسلام کے غیر معمولی اوصاف بھی اسی کا نتیجہ تھے۔ انس بن مالکؓ صحابہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، ہم جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ ہم جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے (واللہ ما کنّا نکذبُ ولا کنّا ندری ما الکذب)

عرب کے صحرا میں اعلیٰ فطری اوصاف سے متصف جو انسان تیار کئے گئے تھے، انھیں کے منتخب افراد ایمان لاکر اصحاب رسول بنے۔ یہ ایک بہترین خام مادہ تھا جو اسلام کی معرفت اور پیغمبر کی رفاقت سے جلا پاکر چمک اٹھا (تفصیل کیلئے: حقیقتِ حج ۵۴ - ۵۸)

خیر امت

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله (آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں خیر امت (بہترین گروہ) سے مراد صحابہ کا گروہ ہے۔ "اخرجت" کے معنی اظہرت یا اوجدت کے ہیں۔ یعنی اس گروہ کو خصوصی اہتمام کے ساتھ نکال کر میدان میں لایا گیا ہے۔ یہ اس صحرائی منصوبہ کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ سے صحابہ کی وہ انوکھی جماعت حاصل کی گئی جس کو پروفیسر ڈی ایس مارگولیتھ (۱۹۴۰-۱۸۵۸) نے ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کا نام دیا ہے۔

اصحاب رسول کون لوگ تھے۔ یہ بنو اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسل کے جد اعلیٰ اسماعیل بن ابراہیمؑ ہیں۔ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے اپنے چھوٹے بچہ اسماعیل اور ان کی ماں ہاجرہ کو عراق سے نکالا اور ان کو لے جا کر حجاز (عرب) کے صحرا میں چھوڑ دیا۔

اس وقت یہ علاقہ ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا۔ وہاں کوئی انسانی آبادی نہ تھی۔ یہ مکمل طور پر فطرت کی ایک دنیا تھی۔ صحرا اور پہاڑ، زمین اور آسمان، سورج اور چاند، بس اس قسم کی چیزیں تھیں جن کے درمیان کسی شخص کو اپنے رات اور دن کو گزارنا تھا۔ یہاں شہریت اور تمدن کا کوئی نشان نہ تھا۔ چاروں طرف صرف فطرت کی پُرہیبت نشانیاں پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ مزید یہ کہ یہاں آرام اور عیش نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ یہاں زندگی سراپا چیلنج تھی۔ آدمی مجبور تھا کہ مسلسل چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اس پُرمشقت ماحول میں زندہ رہنے کی کوشش کرے۔

تمدن کی خرابیوں سے دور اس سادہ ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کے حالات نے انھیں انسانی تکلفات سے دور کر رکھا تھا۔ وہ مصنوعی اخلاق سے بالکل ناآشنا تھے۔ وہ ایک ہی رہنمائی کو جانتے تھے، اور وہ فطرت کی رہنمائی تھی۔ فطرت بلاشبہہ انتہائی معیاری معلم ہے، اور صحرا کی یہ نسل اسی معیاری معلم کے تحت بن کر تیار ہوئی۔

آل عمران کی مذکورہ آیت میں خیرامت کی دو خاص صفتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں۔ یعنی خلافِ حق بات کو برداشت نہ کرنا اور حق سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہونا، یہ ان کا مستقل مزاج ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے گردوپیش سے غیر متعلق رہ کر زندگی گزارتے ہیں یا جن کا رویہ ذاتی مصالح کے تحت متعین ہوتا ہے۔ بلکہ وہ کامل طور پر حق پسند ہیں۔ حق اور ناحق کی بحث میں نہ پڑنا، یا ناحق سے سمجھوتہ کر کے زندہ رہنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

ان کی دوسری صفت یہ بتائی کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ صاحب معرفت لوگ ہیں۔ وہ ظواہر میں گم رہنے والے لوگ نہیں ہیں۔ انھوں نے حقیقت اعلیٰ کو دریافت کیا ہے۔ ان کا شعور پائے ہوئے انسانوں کا شعور ہے۔ انھوں نے مخلوقات کی دنیا کے پیچھے اس کے خالق کا جلوہ دیکھ لیا ہے۔

یہ دونوں صفتیں بے حد نادر صفتیں ہیں۔ حق پسند اور صاحب معرفت وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو بے حد سنجیدہ ہوں۔ جو اصول کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہوں نہ کہ خواہش کی بنیاد پر۔ جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اپنی توجہات کا محور بنائے ہوئے ہوں۔ جو مفاد کے بجائے صداقت کے لیے جینے والے ہوں۔ جو دباؤ کے بغیر اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت صحیح رویہ اختیار کر لیں۔ جو دلیل سے چپ ہو جائیں، بغیر اس کے کہ ان کو چپ کرنے کے لیے کوئی طاقت استعمال کی گئی ہو۔

اس دنیا میں سب سے بڑا قول حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے، اور اس دنیا میں سب سے بڑا عمل حقیقتِ واقعہ سے مطابقت۔ اور اصحاب رسول بلاشبہہ ان نادر انسانوں میں سے تھے جو اس معیارِ انسانیت پر آخری حد تک پورے اترے۔

یہ وہ انسان کامل ہے جس کی انسانیت پوری طرح محفوظ ہوتی ہے۔ جو اپنی تخلیقی فطرت پر قائم رہتا ہے۔ یہی وہ زندہ فطرت والا انسان ہے جو عرب کے صحرائی ماحول میں ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ تیار کیا گیا۔ اور صحابہ کا گروہ وہ منتخب انسانی گروہ ہے جس کو اس مخصوص انسانی نسل سے چن کر نکالا گیا۔

صحابہ وہ لوگ تھے جو دوسروں کی خیر خواہی کے لیے جیے۔ جن کی ساری کوشش یہ تھی کہ وہ لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت میں پہنچا دیں۔ اسی لیے وہ خیرامت قرار پائے۔

ایک شہادت

اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی اراکۃ یقول : صلیت مع علی رضی اللہ عنہ صلاۃ الفجر، فلما انفتل عن یمینہ مکث کأنّ علیہ کابۃ ، حتی اذا کانت الشمس علی حائط المسجد قِیدَ رُمح صلّی رکعتین ثم قلب یدہ فقال : واللہ لقد رأیت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فما اری الیوم شیئاً یُشبہہم؛ لقد کانوا یصبحون صُفراً شُعثاً غُبراً بین اعینہم کامثال رُکب المعزی ۔ قد باتوا للہ سُجّداً و قیاماً ، یتلون کتاب اللہ ، یتراوحون بین جباھہم و اقدامہم ، فاذا اصبحوا فذکروا اللہ مادوا کما یمید الشجر فی یوم الریح وھملت اعینہم حتی تنبل ثیابہم ، واللہ لکأنّ القوم باتوا غافلین ۔ ثم نہض فما رُئِیَ بعد ذلک مفتراً یضحک حتی قتلہ ابن مُلجم عدو اللہ الفاسق ۔

ابن ابی الدنیا نے روایت کی ہے ۔ اسماعیل السدی کہتے ہیں کہ میں نے ابواراکہ تابعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے خلیفہ چہارم علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی ۔ پھر جب انھوں نے اپنے چہرہ کو دائیں طرف پھیرا تو وہ اس طرح رہے جیسے کہ ان کے اوپر شدید غم ہو ۔ یہاں تک کہ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزہ کے برابر آگئی تو انھوں نے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی ۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ کو پلٹتے ہوئے کہا ۔ خدا کی قسم ، میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے ۔ آج میں کوئی چیز ان کے مشابہ نہیں دیکھتا ۔ وہ زرد رو ، پراگندہ بال اور غبار آلود حالت میں صبح کرتے تھے ۔ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے گھٹنے جیسا نشان ہوتا ۔ وہ اپنی رات اللہ کے لیے سجدہ اور قیام میں گزارتے ۔ وہ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ، وہ اپنی پیشانیوں اور قدموں کے درمیان باری باری عمل کرتے ۔ جب وہ صبح کرتے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ، اس وقت وہ ہلتے جس طرح درخت ہوا کے چلنے کے وقت ہلتا ہے ۔ ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں ، یہاں تک کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے ۔ خدا کی قسم ، آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی رات غفلت میں گزاری ۔ علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ، پھر وہ وہاں سے اٹھ گئے ۔ اس کے بعد وہ کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے ،

یہاں تک کہ دشمن خدا ابن ملجم نے ان کو قتل کر دیا (البدایہ والنہایہ ۶/۸)

"خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہونا" اس بات کی علامت ہے کہ وہ دنیا سے آخری حد تک بے رغبت تھے اور آخرت کی طرف آخری حد تک متوجہ ہو چکے تھے۔ دین کی فکر میں وہ اس حد تک گم ہو چکے تھے کہ اہل دنیا اگر دیکھیں تو سمجھیں کہ یہ مجنون لوگ ہیں۔

ذکر اور عبادت اور تلاوت ان کی محبوب ترین چیز ہو چکی تھی۔ لمبے قیام میں انھیں تسکین ملتی تھی۔ ان کے طویل سجدوں کا نشان ان کی پیشانیوں پر نمایاں نظر آتا تھا، وہ اندر سے باہر تک خدا کے نور میں نہائے ہوتے تھے۔ ان کی زندگی تمام تر خدا کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

"اللہ کی یاد کے وقت وہ اس طرح ہلتے جیسے درخت تیز ہوا میں ہلتا ہے" یہ اس کیفیت کا ذکر ہے جو تھرتھراہٹ کے وقت ان کے جسم کی ہوتی تھی۔ اللہ کی یاد ان کے سینہ میں بھونچال کی طرح اٹھتی تھی۔ اس سے ان کی روح کے اندر ایک بجلی دوڑ جاتی اور ان کے جسم پر تھرتھری کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ اللہ کے خوف سے بار بار کانپ اٹھتے تھے۔

"ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں اور ان کے کپڑے بھیگ جاتے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے خدا کا ذکر کوئی تلفظ لسانی کا عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک قلبی عمل ہوتا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے چند الفاظ میں اصحاب رسول کا جو خاکہ بتایا ہے، وہ نہایت کامل اور جامع خاکہ ہے۔ ان مختصر لفظوں میں اصحاب رسول کی وہ تمام بنیادی صفات آجاتی ہیں جن سے وہ متصف تھے اور جنھوں نے ان کو پوری نسل انسانی میں انبیاء کرام کے بعد سب سے اونچا درجہ دیدیا۔

اصحاب رسول بھی مومن تھے جس طرح دوسرے لوگ مومن ہوتے ہیں۔ مگر اصحاب رسول کا ایمان ان کے لیے ایک انتہائی سنجیدہ فیصلہ تھا۔ حتی کہ اس نے انھیں دیوانہ بنا دیا۔ ان کا ایمان ان کے پورے وجود میں چمک اٹھا تھا۔ اللہ کی یاد ان کے لیے ایک روحانی زلزلہ کے ہم معنی تھی۔ آخرت کو ماننا ان کے لیے ایک ایسی طوفان خیز حقیقت پر یقین کرنا تھا جو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بن کر بہہ نکلے۔

اصحاب رسول تاریخ کے سب سے زیادہ زندہ انسان تھے اور تاریخ کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت۔

والذین معہ

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ۔ ذلک مثلھم فی التوراۃ۔ و مثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہٗ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار۔ وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجراً عظیما (الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھوگے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ اور موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے تاکہ ان سے کافروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اصحاب رسول کے بارہ میں ہیں۔ اصحاب رسول کی تاریخی اہمیت کی بنا پر ان کی صفات قدیم آسمانی صحیفوں میں درج کر دی گئی تھیں۔ موجودہ محرف تورات میں اب بھی موجود ہے کہ وہ لاکھوں قدسیوں (saints) میں سے آیا (استثنا ۳۳ : ۲) موجودہ انجیل میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ میں ملتی ہے: خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے۔ اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴ : ۲۶-۲۹) وہ رائی کے دانے کی مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر جب بو دیا گیا تو اُگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے اور ایسی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایہ میں بسیرا کر یں (۳۲)

اس آیت کے پہلے حصہ میں تورات کے حوالہ سے صحابہ کی انفرادی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفات۔

- اصحاب رسول کی پہلی شخصی صفت یہ بتائی کہ وہ منکروں پر سخت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر ایمان نے ان کو ایک با اصول انسان بنا دیا ہے۔ جو لوگ دین خدا کے منکر ہیں یا بے اصول زندگی گزار رہے ہیں، ان کے ساتھ مصالحت کا معاملہ کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ ذاتی مفاد کی خاطر کبھی وہ بے اصولی کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔

"وہ آپس میں مہربان ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ اختلاف اور شکایت کے مواقع پیش آنے کے باوجود وہ ہمدردی اور مہربانی کے رویہ پر قائم رہتے ہیں۔ غیر اہل دین کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اصولی ٹکراؤ کا مسئلہ پیش آتا ہے، وہاں وہ بالکل بے لچک ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے شکایت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، مگر وہ شکایتوں اور تلخیوں کو نظر انداز کر کے حسن سلوک کی روش پر قائم رہتے ہیں۔

"وہ رکوع اور سجدہ میں رہتے ہیں" یعنی وہ نماز قائم کرنے والے ہیں۔ ان کے دن اور ان کی راتیں اللہ کے آگے جھکنے میں اور اس کی عبادت گزاری میں بسر ہوتی ہیں۔

"وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہیں" یعنی ان کے لیے سب سے زیادہ محبوب و مطلوب چیز وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں اور اللہ سے دعا و التجا میں اپنے لمحات گزارتے ہیں۔

"ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے" یعنی ان کے دل کا اللہ کے لیے جھکاؤ ان کے چہروں پر تواضع اور سنجیدگی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ خدا کے ساتھ گہری وابستگی ان کے چہروں پر ربانی جھلک کی صورت میں نظر آتی ہے ——— یہ ان کے انفرادی اوصاف ہیں۔

صحابہ کے انفرادی اوصاف کے ذکر کے بعد ان اوصاف کے اجتماعی انجام کو بیج کی مثال سے بتایا گیا ہے۔ بیج زمین میں بو دیا جائے تو وہ بڑھتے بڑھتے درخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ اوصاف جب افراد انسانی میں پیدا ہو جائیں تو وہ بیرونی دنیا کو متاثر کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچ جاتا ہے جس کا کامل نمونہ اصحاب رسول کی صورت میں تاریخ میں قائم ہوا۔

اعترافِ حق

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عمر بن الخطاب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے منافق یہ گمان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ مگر خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جیسا کہ موسیٰ بن عمران گئے تھے۔ وہ اپنی قوم سے چالیس دن کے لیے غائب ہو گئے تھے، پھر ان کی طرف واپس آئے جب کہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ وہ مرگئے۔ خدا کی قسم، رسول اللہؐ ضرور اسی طرح لوٹ کر آئیں گے جس طرح موسیٰ لوٹ کر آئے۔ پھر آپ ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے جن کا یہ گمان ہے کہ آپ پر موت واقع ہوگئی ہے۔

ابوبکرؓ کو خبر ہوئی تو وہ آئے اور مسجد کے دروازے پر اترے۔ اس وقت عمرؓ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ ابوبکر سیدھے آپ کے حجرہ میں گئے۔ ابوبکرؓ نے آپ کے چہرہ سے چادر اٹھائی اور اس کو بوسہ دیا، پھر کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، اللہ نے جو موت آپ کے لیے مقدر کی تھی، وہ آپ پر آچکی۔ اس کے بعد اب آپ پر موت کی مصیبت آنے والی نہیں۔ اس کے بعد ابوبکرؓ نے آپؐ کے چہرے کے اوپر چادر ڈال دی اور باہر آئے۔ عمرؓ برابر لوگوں کے سامنے بول رہے تھے۔ ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ اے عمر ٹھہرو، خاموش ہو جاؤ۔ عمرؓ نے چپ ہونے سے انکار کیا۔ ابوبکرؓ نے جب دیکھا کہ عمر چپ ہونے پر تیار نہیں ہیں تو وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ لوگوں نے جب ابوبکر کی آواز سنی تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمر کو چھوڑ دیا۔

ابوبکر نے حمد و ثنا کے بعد کہا کہ اے لوگو، جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو محمد مر گئے۔ اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، وہ کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کے بعد ابوبکر نے یہ آیت پڑھی:

وما محمد الا رسول قد خلت من	اور محمد بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت
قبله الرسل افأن مات او قتل	سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں
انقلبتم علیٰ اعقابكم ومن ينقلب على	یا قتل کر دیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔
عقبيه فلن يضر الله شيئا	اور جو آدمی پھر جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا

وسیجزی اللہ الشاکرین (آل عمران ۱۴۴)   اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔

راوی کہتے ہیں کہ جب ابوبکر نے یہ آیت پڑھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے۔ اب ابوبکرؓ سے اس آیت کو سن کر لوگوں نے اس کو اخذ کرلیا۔ اس کے بعد یہ آیت تمام لوگوں کی زبان پر تھی۔

راوی کہتے ہیں کہ عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم، جب میں نے ابوبکر کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو میں دہشت زدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا۔ اور میرے دونوں پاؤں میرا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ اور میں نے جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی (سیرۃ ابن ہشام ۴/۳۵-۳۳۴)

عمر فاروق اس وقت اتنے جوش میں تھے کہ ابوبکر صدیق کی باتوں سے چپ نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن کی ایک آیت پڑھ دی تو اچانک وہ ڈھ پڑے۔ حالانکہ ابوبکر صدیق پہلے بھی کچھ الفاظ بول رہے تھے، اور اب بھی انھوں نے کچھ الفاظ ہی اپنی زبان سے نکالے تھے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ پہلے الفاظ انسان کے الفاظ تھے، اور دوسرے الفاظ خدا کے الفاظ۔

اس سے اصحاب رسول کی ایک نہایت اہم صفت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اصحاب رسول اللہ کا حکم آتے ہی اس کے آگے ڈھ پڑنے والے لوگ تھے۔ عام انسان قیامت میں رب العالمین کو دیکھ کر اس کے آگے ڈھ پڑے گا۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اسی دنیا میں رب العالمین کو دیکھے بغیر اس کے آگے ڈھ پڑے۔ منکرین خدا پر جو کچھ موت کے بعد بیتنے والا ہے، وہ اصحاب رسول پر موت سے پہلے کی زندگی میں بیت گیا۔ دوسرے لوگ جس چیز کو مجبوری کے تحت قبول کریں گے، اس کو اصحاب رسول نے خود اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت اختیار کرلیا۔

انسان کو موجودہ دنیا میں اسی خاص امتحان کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہاں انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ مگر یہ آزادی برائے آزمائش ہے نہ کہ برائے انعام۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص ہے جو آزادی پاکر سرکش ہو جاتا ہے، اور کون ہے جو آزادی پانے کے باوجود اللہ کے آگے جھک جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اسی خدائی مطلوب کا عملی نمونہ تھے۔ انھوں نے خدا کے حکم کو عملاً اختیار کرکے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ آدمی کو کیسا بننا چاہیے، اور اپنی آزادی کو اسے کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔

بے نفسی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی موت کا وقت آجائے اور اس کو اپنے مال کے بارہ میں وصیت کرنا ہے تو اس کو چاہیے کہ دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا کر وہ اپنی وصیت کرے۔ اس سلسلہ میں احکام بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ بعد کو گواہی دینے کے وقت اگر یہ بات علم میں آئے کہ ان دونوں گواہوں نے گواہی دینے میں کوئی حق تلفی کی ہے تو ان کی جگہ دوسرے دو شخص وراثت کے حق داروں میں سے کھڑے ہوں۔ جو میت سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہوں۔ یہ دوسرے دونوں آدمی قسم کھا کر کہیں کہ ہماری گواہی ان دونوں اولیٰ بالشہادۃ گواہوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے (المائدہ ۱۰۷)

اس آیت کا ایک ٹکڑا یہ ہے: مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الاولیان (ان میں سے جن کا کہ حق دبا ہے جو سب سے قریب ہوں میت کے) اس آیت کے ایک لفظ (الاولیان) کی قرأت میں اختلاف ہے۔ الحسن نے اس کو الاوّلان پڑھا ہے۔ اور ابن سیرین نے اس کو الاوّلین پڑھا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے:

عن ابی مجلز ان اُبیّ بن کعب قرأ (من الذین استحق علیهم الاولیان) فقال عمر عنہ کذبت۔ قال انت اکذب۔ فقال رجل۔ تکذّب امیرالمومنین۔ قال: انا اشد تعظیما لحق امیرالمومنین منك۔ ولکن کذّبتُه فی تصدیق کتاب اللہ، ولم اصدّق امیرالمومنین فی تکذیب کتاب اللہ۔ فقال عمر صدق (حیاۃ الصحابۃ ۲/۷۴-۷۵)

ابو مجلز سے روایت ہے کہ ابی بن کعب نے یہ آیت پڑھی (من الذین استحق علیہم الاولیان) پس عمر نے ان سے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ انھوں نے کہا کہ تم خود زیادہ جھوٹے ہو۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ تم امیر المومنین کو جھوٹا کہتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے زیادہ امیر المومنین کے حق کی تعظیم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اللہ کی کتاب کی تصدیق کے معاملہ میں جھٹلایا ہے۔ میں نے کتاب اللہ کی تکذیب کے معاملہ میں امیر المومنین کی تصدیق نہیں کی۔ عمر نے یہ سن کر کہا کہ انھوں نے سچ کہا۔

اس واقعہ میں ایک صحابی نے دوسرے صحابی پر سخت تنقید کی جو کہ وقت کا سربراہ سلطنت

تھا۔ مگر ناقد صحابی کا معاملہ یہ تھا کہ سخت ترین لفظوں میں تنقید کرنے کے باوجود زیر تنقید صحابی کے شخصی احترام میں ان کے اندر کوئی کمی نہیں آئی۔ اور دوسری طرف زیر تنقید صحابی کا معاملہ یہ تھا کہ اعلیٰ منصب پر ہونے کے باوجود انھوں نے اس سخت تنقید کو برا نہیں مانا۔

یہ صفت اجتماعی زندگی اور اجتماعی اتحاد کے لیے بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صفت کے بغیر نہ کوئی معاشرہ بہتر معاشرہ بن سکتا اور نہ اس کے اندر اتحاد کا ماحول قائم ہو سکتا ہے۔ مگر یہ قیمتی صفت انتہائی نادر اور انوکھی ہے۔ اور جماعت کی سطح پر معلوم تاریخ میں صحابہ کے علاوہ کہیں اور پائی نہیں گئی۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے خلاف بولنا پڑتا ہے۔ یہ بولنا زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ مگر بولنے والا معاملہ کو صاحبِ معاملہ سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتا۔ اس لیے وہ معاملہ پر تنقید کرنے کے ساتھ صاحبِ معاملہ سے بیزار بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اصحاب رسول اس اعتبار سے ایک تاریخی استثنار تھے۔ اصحاب رسول کے درمیان تنقید کا عام رواج تھا۔ مگر تنقید کرنے والا ہمیشہ "بات" پر تنقید کرتا تھا۔ وہ زیر تنقید آدمی کی شخصیت سے نہ تو متنفر ہوتا تھا اور نہ اس کے احترام میں کوئی کمی کرتا تھا۔

یہی حال زیر تنقید شخص کا بھی تھا۔ وہ سخت سے سخت تنقید کو سنتا تھا۔ مگر وہ تنقید کی ظاہری سختی کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل تنقید پر سوچنے لگتا تھا کہ وہ قابلِ قبول ہے یا ناقابلِ قبول۔

تنقید کی چوٹ بہت کڑی چوٹ ہے۔ اپنے خلاف تنقید سنتے ہی آدمی کے اندر ایک آگ سی لگ جاتی ہے، مگر صحابہ کرام اس سے بہت بلند تھے۔ صحابہ کا حال یہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنے خلاف تنقید کو ٹھنڈے دماغ سے سنتے تھے، بلکہ ناقد کے سخت ترین الفاظ کی بھی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

اس کی وجہ صحابہ کرام کی ربانیت تھی۔ ان کے ایمان نے ان کو ایسی بلند فکری سطح پر پہنچا دیا تھا کہ اس کے بعد ہر چیز انھیں ہیچ دکھائی دیتی تھی۔ وہ حقیقت اعلیٰ میں اتنا زیادہ گم ہو چکے تھے کہ وہ نہ ذاتی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور نہ ذاتی تنقید پر غمگین۔ وہ ہر بات پر بات کی حیثیت سے غور کرتے تھے خواہ وہ ان کی پسند کی بات ہو یا ناپسندیدگی کی بات۔ وہ ہر واقعہ کو اس کی اصلیت کے اعتبار سے دیکھتے تھے نہ کہ اِس اعتبار سے کہ وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

حمیت جاہلیہ نہیں

قرآن کی سورہ الفتح میں اللہ کی اس خصوصی نصرت کا ذکر ہے جو اصحاب رسول کو حاصل ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ انھوں نے صراط مستقیم کو پالیا۔ وہ دشمنوں کے ہاتھ سے محفوظ ہو گئے۔ زمین پر دین خداوندی کا اظہار ہوا۔ مخالفین کے علی الرغم انھیں فتح مبین حاصل ہوئی۔ اصحاب رسول کا وہ کون سا عمل تھا جس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی اس خصوصی رحمت و نصرت کے مستحق قرار پائے، اس کا ذکر سورہ الفتح کی متعدد آیتوں میں موجود ہے۔ ایک آیت یہ ہے :

اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ حمیۃ الجاھلیۃ فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمۃ التقوی وکانوا احق بھا واھلھا وکان اللہ بکل شیئ علیما (الفتح ۲۶)	جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اللہ نے ان کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اس کے زیادہ حقدار اور اس کے اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اس آیت میں اصحاب رسول کے اس رویہ کا ذکر ہے جو انھوں نے واقعۂ حدیبیہ کے موقع پر اختیار کیا۔ اس رویہ کو یک طرفہ صبر، یا اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا کہہ سکتے ہیں۔

۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر عمرہ ادا کریں۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے کہ مکہ کے مشرکین نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انھوں نے اس معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنالیا۔

آپ کو واپسی پر مجبور کرنے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی جارحانہ کارروائیاں کیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہر موقع پر جوابی جارحیت سے بچتے رہے تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان تصادم کی نوبت نہ آئے۔ اس دوران مکہ والوں کی طرف سے مختلف وفد بات چیت کے لیے آتے رہے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ دونوں فریقوں کے درمیان لمبی مدت کا ایک معاہدہ ہو جائے

تاکہ دونوں اپنی اپنی حد پر رہیں اور کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کر سکے۔

حدیبیہ کے واقعہ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ آخری مرحلہ میں جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو قریش مکہ کے نمائندہ کی طرف سے نہایت اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا۔ قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ہم اس کو نہیں مانتے، آپ بسمك اللهم لکھئے۔ پھر آپ نے لکھوایا کہ "محمد رسول اللہ کی طرف سے"۔ قریش کے نمائندہ نے اس کو بھی رد کر دیا اور کہا کہ محمد بن عبد اللہ لکھئے۔ یہ باتیں بے حد جگر خراش تھیں مگر صحابہ پر اللہ نے "سکینت" اتاری اور وہ ان شرطوں پر راضی ہو گئے۔

اسی طرح قریش کے نمائندہ نے معاہدہ میں یہ لکھوایا کہ مکہ کا کوئی آدمی اسلام قبول کر کے مدینہ چلا جائے تو آپ اس کو ہماری طرف لوٹانے کے پابند ہوں گے۔ اور اگر مدینہ کا کوئی آدمی ہم پکڑ لیں تو ہم اس کو آپ کی طرف نہیں لوٹائیں گے۔ یہ یک طرفہ شرط توہین کی حد تک ناقابل برداشت تھی مگر اصحاب رسول نے اللہ کی خاطر اس کو بھی برداشت کر لیا۔ معاہدہ کی کتابت کے دوران مکہ کے ایک مسلمان ابو جندل وہاں آ گئے۔ ان کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان کا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ قریش کے نمائندہ نے کہا کہ معاہدہ کے مطابق ابو جندل کو ہماری طرف واپس کیجئے۔ ابو جندل نے کہا کہ کیا میں کافروں کی طرف لوٹایا جاؤں گا تاکہ وہ مجھے فتنہ میں ڈالیں۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا مگر اپنے کھولتے ہوئے جذبات کو دبا کر اصحاب رسول اس مطالبہ پر بھی راضی ہو گئے۔

یہ صحابہ کی شخصیت کا ایک انوکھا پہلو تھا۔ وہ مسلسل اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔ جارحیت کے باوجود انھوں نے جوابی کارروائی نہیں کی۔ عمرہ کو وقار کا مسئلہ بنائے بغیر وہ حدیبیہ سے واپسی پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے فریق ثانی کی یک طرفہ شرطوں کو مان کر جنگ کی حالت کو امن کی حالت میں بدل دیا۔

واقعۂ حدیبیہ کے دوران فریق ثانی نے ناقابل برداشت حالات پیدا کیے۔ مگر اصحاب رسول ان کو برداشت کرتے رہے۔ مخالفین کی حمیت جاہلیہ کا جواب انھوں نے اسلامی سکینت کی صورت میں دیا۔ اصحاب رسول کا یہ رویہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا۔ اس نے اپنی اعلیٰ تدبیر سے ایسے راستے کھولے کہ اصحابِ رسول کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ مکہ کو فتح کر لیں۔ یہود کی جڑیں کاٹ دیں، اور پورے عرب میں اسلام کو ایک غالب دین کی حیثیت سے قائم کر دیں۔

وقافاً عند کتاب اللہ

قرآن کی ایک تعلیم وہ ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔ یعنی نادان لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل نہ ہونا، حتیٰ کہ اگر اس قسم کی بات کو سن کر غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو اس کو شیطانی وسوسہ سمجھ کر اس سے پناہ مانگنا۔ اور ہر حال میں نظر انداز کرنے کے رویہ پر قائم رہنا۔ اس سلسلہ میں قرآن کا حکم یہ ہے :

خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين- واما ينزغنّك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم- ان الذين اتقوا اذا مسّهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون- واخوانهم يمدونهم في الغيّ ثم لا يُقصرون (الاعراف ۲۰۲ - ۱۹۹)

درگزر کرو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ اللہ کا ڈر رکھتے ہیں، جب ان کو شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں۔ اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو لوگ شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

صحیح البخاری، کتاب التفسیر (سورۃ الاعراف) میں باب خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين کے تحت ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے :

عُبید اللہ بن عبد اللہ بن عُتبہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباسؓ نے ان سے بیان کیا۔ عُیینہ بن حصن بن حُذیفہ مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے الحر بن قیس کے مکان پر ٹھہرے۔ الحر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جن کو عمر اپنے قریب جگہ دیتے تھے۔ وہ ان کے مشیروں میں سے تھے۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اے میرے بھتیجے، تم کو امیر المومنین کے یہاں قربت حاصل ہے۔ میری ان سے ملاقات کرادو۔ اس کے بعد الحر نے عمر سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔

عیینہ جب عمرؓ کے یہاں پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، خدا کی قسم تم ہم کو نہ کچھ

مال دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو۔ عمر یہ سن کر غصہ میں آگئے اور ان پر اقدام کرنا چاہا۔ اس وقت الحر بن قیس نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے نبی کو یہ حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو معاف کر دو اور معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو (الاعراف ۱۹۹) اور یہ آدمی بلاشبہہ جاہلوں میں سے ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اس کے بعد عمر نے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا، جب کہ انھوں نے قرآن کی یہ آیت ان کے سامنے پڑھ دی۔ اور عمر خدا کی کتاب پر بہت زیادہ رک جانے والے تھے (واللہِ ماجاوزَها عمر حين تلاها عليهِ وكانَ وقّافاً عندَ كتابِ الله)

یہ مثال اصحاب رسول کی ایک اہم صفت کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ اصحابِ رسول اللہ کی کتاب کے سامنے فوراً ٹھہر جانے والے (وقّافاً عند كتاب الله) تھے۔ خدا کا حکم سامنے آنے کے بعد وہ اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں اور اپنی زبان کو بلاتاخیر روک لینے والے تھے۔ ایک دلیلِ حق ان کے چلتے ہوئے قدموں میں بیڑی ڈال دینے کے لیے کافی تھی، خواہ اس کے پیچھے کوئی محسوس اور مادی طاقت موجود نہ ہو۔

یہ ایک انتہائی نادر صفت ہے جس کا مظاہرہ صحابۂ کرام کے ذریعہ دنیا کے سامنے ہوا۔ جب آدمی کے اندر غصہ بھڑک اٹھے۔ جب اس کے لیے "میں" کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس وقت وہ کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جن کو سخت ہیجانی حالت میں بھی قرآن کی ایک آیت خاموش کر دینے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

موجودہ دنیا میں خدا کا حکم لفظ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مگر ایک لفظی حکم سن کر ان کا یہ حال ہوتا تھا گویا کہ خود خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

جس آدمی سے اختلاف پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ عدل کا رویہ برتنا، جس آدمی نے انا پر چوٹ لگائی ہے اس کے مقابلہ میں صبر کر لینا، جس آدمی نے اپنے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے غصہ بھڑکا دیا ہے اس کے خلاف اپنے غصہ کو برداشت کر لینا، جس آدمی نے تحقیر و تذلیل کا انداز اختیار کیا ہے اس سے انتقام نہ لینا، یہ سب اعلیٰ ترین انسانی اوصاف ہیں۔ صحابہ کرام وہ مثالی لوگ ہیں جو ان اوصاف میں کمال کی حد تک پورے اترے۔

سنتِ خداوندی

غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب پر نظر ڈالی تو وہ تین سو سے کچھ زیادہ تھے۔ پھر آپ نے مشرکوں کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔ اور آپ کے اوپر آپ کی چادر تھی۔ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے :

اللھم انجزلی ما وعدتنی اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام فلا تعبد بعد فی الارض ابدا (البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۰۵)	اے اللہ، اس وعدہ کو پورا فرما جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کے اس گروہ کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہو گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جیش اسامہ کی شام کی طرف روانگی اسلامی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس وقت عرب میں بغاوت پھیل گئی تھی۔ مگر خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق کے اس مومنانہ اقدام نے از سر نو اسلام کا دبدبہ قائم کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا :

واللہ الذی لا الہ الا ھو، لولا ان ابابکر استخلف ما عبد اللہ (البدایۃ والنہایۃ ۶/۳۰۵)	اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اگر (رسول اللہ کے بعد) ابوبکر کو خلیفہ نہ بنایا جاتا تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔

یہ دونوں قول بظاہر بہت عجیب ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ نے جب یہ کہا تو سننے والے بولے کہ اے ابوہریرہ چپ رہو (مہ یا اباھریرۃ) مگر یہ الفاظ عین حقیقت واقعہ کا اظہار تھے۔

اصل یہ ہے کہ اس قول کا تعلق اللہ کی سنت سے ہے نہ کہ اللہ کی قدرت سے۔ اللہ کے لیے بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہواؤں کے ذریعہ تمام مشرکوں کو ہلاک کر دے اور ایک لفظ کُن کے ذریعہ تمام انسانوں کو اپنا عبادت گزار بنا دے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں خود اللہ کے اپنے فیصلہ کی بنا پر ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں سارا کام اسباب وعلل کے پردہ میں انجام دیا جاتا ہے ——— مذکورہ قول

کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ الٰہی کے تحت ایسا نہیں ہوگا، نہ یہ کہ باعتبار امکان ایسا نہیں ہوسکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دعا کے وقت جو الفاظ نکلے، یا حضرت ابوہریرہ نے جو بات کہی، ان سے صحابہ کے گروہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہ عام قسم کے انسان نہ تھے۔ یہ ایک منفرد ٹیم تھی جو عرب کے صحرا میں خصوصی اہتمام کے ذریعہ تیار کی گئی تھی۔ اگر یہ انسان ضائع ہوجاتے تو دوبارہ تاریخ وہیں واپس چلی جاتی جہاں وہ صحابہ کے دور سے پہلے تھی۔

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ دنیا سے فتنہ ختم ہو، اور دینِ خداوندی کا عالمی اظہار ہو۔ یعنی دنیا سے شرک کے غلبہ کا دور ختم ہوجائے، اور توحید کے غلبہ کا دور قائم ہوجائے۔ یہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ کیونکہ اس کو مکمل طور پر اسباب کے دائرہ میں انجام دینا تھا۔ یہ گویا ایک خدائی واقعہ کو انسانی سطح پر ظہور میں لانا تھا۔

اس کے لیے ایسے حقیقت شناس انسان درکار تھے جو ایک ہم عصر پیغمبر کو پہچان کر ہمہ تن اس کے ساتھی بن جائیں۔ اس کے لیے ایسے پختہ کردار لوگ مطلوب تھے جو ایک بار عہد کرنے کے بعد پھر کبھی اس سے نہ پھریں، خواہ اس راہ میں ان کا سب کچھ لٹ جائے۔ اس کے لیے ایسا بامقصد گروہ درکار تھا جو مقصدِ حق کے سوا ہر دوسری چیز کو ثانوی حیثیت دے دے۔ اس کے لیے ایسے بہادر انسانوں کی ضرورت تھی جو چٹانوں سے ٹکرا جائیں اور اس وقت تک نہ رکیں جب تک اپنے مشن کو مکمل نہ کرلیں۔ اس کے لیے ایسے اعلیٰ ظرف افراد درکار تھے جو اختلاف کے باوجود متحد رہیں اور شکایت کے باوجود اپنا تعاون ختم نہ کریں۔

اصحابِ رسول اسی قسم کے نادر انسان تھے۔ وہ خاص اسی مقصد کے لیے ڈھائی ہزار سالہ تربیتی کورس کے تحت بنائے گئے تھے۔ اگر ان کے ذریعہ مذکورہ مشن اپنی تکمیل تک نہ پہنچتا تو دوبارہ ایک اور ابراہیمی شخصیت کی ضرورت ہوتی اور تاریخ کو پھر ڈھائی ہزار سال تک انتظار کرنا پڑتا تاکہ مطلوبہ نوعیت کی ایک ٹیم بنے اور اس کو استعمال کرکے خدا کے دین کا عالمی اظہار کیا جائے۔

اصحابِ رسول انسانی تاریخ کے وہ منتخب افراد تھے جن کی ذات پر انسانی ارادہ اور خدائی منصوبہ دونوں ایک ہوگیا تھا۔ ایسے افراد تاریخ کے ہزاروں سال کے عمل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مقصد کی تکمیل سے پہلے ختم ہوجائیں تو تاریخ کا سفر رک جائے گا۔

میں کو حذف کرنا

غزوۂ بدر ۲ھ میں پیش آیا۔ اچانک صورت حال کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین مکہ کے مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ کیونکہ اس مقابلہ کے لیے مہاجرین کی تعداد ناکافی تھی، انصار کا معاملہ یہ تھا کہ اپنی بیعت کی رو سے وہ صرف مدینہ کے اندر آپ کی حمایت کے پابند تھے۔ مدینہ سے باہر نکل کر دشمنوں سے مقابلہ کرنا ان کے واجباتِ بیعت میں شامل نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اے لوگو، مجھے مشورہ دو۔ اس کے جواب میں مہاجرین میں سے کچھ لوگوں نے اٹھ کر آپ کو اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ آپ نے کئی بار کہا کہ اے لوگو مجھے مشورہ دو، اور ہر بار مہاجرین اٹھ کر جواب دیتے رہے۔

آخر انصار کو احساس ہوا کہ غالباً آپ ہمارا خیال جاننا چاہتے ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی فوراً ان کے سردار اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ اب ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ دیں۔ اے خدا کے رسول، آپ جو چاہتے ہیں، اس کو کر گزریے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم اگر آپ یہاں سے روانہ ہوں اور چلتے چلتے سمندر میں داخل ہو جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں داخل ہو جائیں گے۔ ہم میں سے کوئی شخص پیچھے نہ رہے گا (البدایہ والنہایہ ۳/۶۳-۲۶۲)

اسی طرح صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد جب امن ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ اطراف عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کریں۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو دعوتی پیغام کے ساتھ عجمی بادشاہوں کی طرف بھیجوں۔ پس تم لوگ میرے ساتھ اختلاف نہ کرو جس طرح بنو اسرائیل نے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ اختلاف کیا۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ سے کسی معاملہ میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو جہاں چاہے وہاں بھیجئے (البدایہ والنہایہ ۴/۲۶۸)

یہ واقعات اصحاب رسول کی ایک نہایت اہم خصوصیت کو بتا رہے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے ـــــ

"میں" کو حذف کرکے کسی شخص کا ساتھ دینا۔

ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ لوگ ابتدائی جذبہ کے تحت کسی کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر جب ناموافق باتیں پیش آتی ہیں تو وہ فوراً اختلاف کرکے الگ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اصحاب رسول (انصار) بدر کی لڑائی کے موقع پر کہہ سکتے تھے کہ ہم نے داخلی دفاع کا عہد کیا ہے، ہم نے خارجی مقابلہ کا آپ سے عہد نہیں کیا (البدایہ والنہایہ ۳/۲۶۲) مگر انھوں نے اس پہلو کو نظر انداز کرکے آپ کا ساتھ دیا۔ جب کہ یہ ساتھ دینا بظاہر موت کے غار میں کودنے کے ہم معنی تھا۔ کیونکہ دشمن کے پاس ایک ہزار افراد کی طاقتور اور مسلح فوج تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ۳۱۳ آدمیوں کی نسبتاً کمزور جماعت۔

اسی طرح حکمرانوں کے نام دعوتی وفود بھیجنے کے سلسلہ میں وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ابھی تو عرب میں بھی اسلام پوری طرح نہیں پھیلا۔ ابھی داخلی استحکام کے اعتبار سے ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ ایسی حالت میں بیرون ملک وفود بھیجنے کا کیا موقع ہے۔

مگر اصحاب رسول نے اس قسم کے ہر خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ انھوں نے عذر کو عذر نہیں بنایا۔ انھوں نے "میں" کو حذف کرکے آپ کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ اختلاف اور شکایت کے ہر معاملہ کو اللہ کے حوالے کرکے وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ رسول خدا کی قیادت کے تحت اسلام کی خدمت کرتے رہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائیں۔

ایک مفکر نے کہا کہ اگر تمہارے پاس بہترین عذر ہے تب بھی تم اس کو استعمال نہ کرو:

If you have a good excuse don't use it.

مغربی مفکر نے یہ بات بطور آئیڈیل کہی تھی۔ مگر اس آئیڈیل کو پہلی بار جن لوگوں نے عملی واقعہ بنایا وہ اصحاب رسول تھے۔ انھوں نے اختلاف کو نظر انداز کرکے اتحاد کیا۔ انھوں نے شکایتوں کو بھلا کر ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنی ذات کو حذف کرکے اپنے آپ کو اجتماعیت سے وابستہ کیا۔ وہ اپنے جذبات کو دبا کر مقصد کی تکمیل میں لگے رہے۔ انھوں نے پانے کی امید کے بغیر دیا۔ انھوں نے کریڈٹ لینے کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال کر قربانیاں دیں۔ عام لوگ جس حد پر رک جاتے ہیں ان حدوں پر رکے بغیر وہ آگے بڑھ گئے۔

اصحاب رسولؐ

خالد بن ولید اور عبد الرحمٰن بن عوف کے درمیان کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔ اس موقع پر حضرت خالد کی زبان سے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے لیے کچھ سخت کلمات نکل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا:

لا تسبُّوا اصحابی، لا تسبوا اصحابی۔ فوالذی نفسی بیدہ لو انّ احدکم انفق مثل اُحُدٍ ذھباً ما بلغ مُدّ احدھم ولا نصیفہ
(مسلم، باب تحریم سب الصحابہ)

میرے اصحاب کو برا نہ کہو، میرے اصحاب کو برا نہ کہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کردے تو وہ ان کے ایک مد یا اس کے نصف کے برابر بھی نہیں پہنچے گا۔

صحابہ کرام کی وہ کیا خاص صفت تھی جس کی بنا پر انھیں یہ امتیازی مقام ملا۔ قرآن کے لفظوں میں وہ تھی ــــــ مشکل گھڑیوں میں اتباع کرنا (التوبہ ۱۱۷) فتح کا دور آنے سے پہلے قربانیاں پیش کرنا (الحدید ۱۰)

آج پیغمبر اسلام کی رسالت ایک ثابت شدہ رسالت ہے۔ آپ کا نام بلند ترین عظمت کا نشان بن چکا ہے۔ آج آپ کے نام پر اٹھنے والے کو ہر قسم کی عزت اور ہر قسم کے مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسا آدمی فوراً قوم کے درمیان قائد کا مقام پالیتا ہے۔ مگر جس وقت صحابہ کرام نے آپ کا ساتھ دیا، اس وقت یہ تمام امکانات ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ابھی واقعہ بن کر لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔

صحابہ کرام کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حال کے پیغمبر کو اس کے مستقبل کی عظمتوں کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے بظاہر ایک عام انسان کو اس کے پیغمبرانہ جوہر کے ساتھ دریافت کیا۔ انھوں نے اس وقت پیغمبر کا ساتھ دیا جب کہ پیغمبر کا ساتھ دینے کا مطلب پوری قوم میں نکو بن جانا تھا۔ جب پیغمبر کی حمایت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آدمی اپنی قوم اور اپنی برادری کی حمایت سے محروم ہو جائے۔

صحابہ کرام کا ایمان ایک دریافت تھا۔ آج کے مسلمانوں کا ایمان ایک قومی تقلید ہے۔ ان

دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آسمان اور زمین میں۔

لبید بن ربیعہ (م ۴۱ھ) عرب کے بڑے شاعروں میں سے تھے۔ وہ اصحاب معلقات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ انھوں نے جواب دیا: ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی)

حضرت لبید کا یہ قول آج بظاہر کوئی غیر معمولی قول نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج لوگوں کے ذہنوں پر قرآن کی عظمت اتنی زیادہ چھائی ہوئی ہے کہ یہ بالکل ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص قرآن کے اعلیٰ ادب سے متاثر ہو کر شاعری کو چھوڑ دے۔ مگر اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ حضرت لبید نے ایسا کیا، اس وقت یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات تھی۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں قرآن کی حیثیت ایک عام کتاب کی سی تھی۔ اس وقت وہ لوگوں کے درمیان ایک نزاعی کتاب بنی ہوئی تھی، اس وقت تک قرآن کی پشت پر وہ واقعاتی عظمتیں اور تاریخی صداقتیں جمع نہیں ہوئی تھیں جو آج اس کی پشت پر جمع ہو چکی ہیں۔

صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے دور عظمت سے پہلے قرآن کو پہچانا۔ جنھوں نے اس وقت اپنے آپ کو اسلام کے لیے وقف کیا جب کہ اسلام ہر قسم کے مادی مفادات سے خالی تھا۔ جو اس وقت پیغمبر کے حامی بنے جب کہ پیغمبر کے نام پر کسی قسم کی قیادت نہیں ملتی تھی۔ جنھوں نے محرومی کی قیمت پر دین خداوندی کو اپنایا اور بے قدر ہو کر اس کی کامل قدر دانی کی۔ انھوں نے "بے اسلام" میں اسلام کی تصویر دیکھی۔

اصحاب رسول کا امتیازی مقام ان کے امتیازی عمل کی بنا پر ہے۔ ان کا یہ امتیازی عمل، ایک لفظ میں، یہ تھا کہ انھوں نے ساتھ نہ دینے والے حالات میں ساتھ دیا۔

اصحاب رسول نے بے اعترافی کے حالات میں اعتراف کیا۔ انھوں نے ناقدری کے حالات میں قدر دانی کی۔ انھوں نے التباس کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو پہچانا۔ انھوں نے بے عظمت چیز کو عظمت کے روپ میں دیکھا۔ انھوں نے وہاں بینا ہونے کا ثبوت دیا جہاں لوگ اندھے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں سچائی کی آواز سنی جہاں کان والوں کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

نہیں میں ہے کو دیکھنا

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس وقت ایران کا بادشاہ یزدگرد اور اس کا سپہ سالار رستم تھا۔ سعد بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں جو مسلم لشکر ایران میں داخل ہوا، اس کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار سے کچھ زیادہ تھی، جب کہ رستم کی فوج کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ اس کے باوجود اہلِ اسلام کی فتوحات کی خبریں سن کر ایرانی حکمراں خائف تھے۔ انھوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو پیغام بھیجا کہ بات چیت کے لیے اپنا سفیر روانہ کریں۔

اس سلسلہ میں صحابۂ کرام کے کئی وفد مدائن گئے اور رستم اور یزدگرد سے بات کی۔ ان لوگوں نے انتہائی بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً ربعی بن عامر ایرانی دربار میں داخل ہوئے تو وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تخت تک چلے گئے۔ انھوں نے اپنا نیزہ قالین میں گاڑ کر اس سے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ انھوں نے ایرانی حکمرانوں سے نہایت بے باکی کے ساتھ گفتگو کی جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

آخری مرحلہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایرانی شہنشاہ یزدگرد ان کی باتیں سن کر بگڑ گیا۔ اس نے غصہ ہو کر مسلم وفد سے کہا کہ اگر یہ دستور نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہ کیے جائیں تو میں تم لوگوں کو قتل کر دیتا۔ تمہارے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ تم اپنے سردار (سعد بن ابی وقاص) کے پاس جاؤ اور ان کو بتا دو کہ میں رستم کو ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیج رہا ہوں جو تم لوگوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے پوچھا کہ تمہارے وفد کا سب سے معزز شخص کون ہے۔ تاکہ میں اس کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ کر اس کو یہاں سے واپس کروں۔ لوگ اس سوال پر چپ رہے۔ آخر وفد کے ایک عام رکن عاصم بن عمرو کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تم جس کو چاہتے ہو وہ شخص میں ہوں۔ تم مٹی میرے سر پر رکھ دو۔ یزدگرد نے لوگوں سے پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں وہ ہمارے معزز شخص ہیں۔

اس کے بعد یزدگرد نے مٹی سے بھرا ہوا ایک ٹوکرا منگایا اور اس کو ان کے سر پر رکھ دیا۔ اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ عاصم بن عمرو مٹی کا ٹوکرا لیے ہوئے محل کے باہر آئے۔ اس کو انھوں نے اپنی سواری پر رکھا اور تیزی سے روانہ ہو کر وہاں پہنچ گئے جہاں سعد بن ابی وقاص ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے خیمہ میں داخل ہو کر مٹی کا ٹوکرا سردار کے سامنے رکھ دیا اور ان کو واقعہ بتایا۔ راوی کہتے ہیں:

فقال : اَبشروا فقد واللہ اعطانا اللہ اقالید ملکھم وتفاء لوابذلك اخذ بلادھم۔ ثم لم یزل امر الصحابۃ یزداد فی کل یوم علواً وشرفاً ورفعۃ وینحط امر الفرس سفلا وذلا وھنا

سعد بن ابی وقاص نے کہا کہ تم کو خوش خبری ہو۔ خدا کی قسم، اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دیدیں۔ اور مٹی سے انھوں نے نیک فال لیا کہ ان کا ملک ہمیں حاصل ہوگا۔ اس کے بعد صحابہ ہر روز بلندی اور شرف اور رفعت میں بڑھتے رہے اور ایرانی پستی اور ذلت اور ناکامی میں گرتے چلے گئے۔

مسلم وفد کو محل سے نکال دینے کے بعد یزدگرد نے یہ واقعہ رستم کو بتایا۔ اور مٹی کا ٹوکرا سر پہ رکھنے کے معاملہ کو ان کی حماقت قرار دیا۔ رستم نے کہا کہ نہیں، وہ آدمی احمق نہیں تھا، خدا کی قسم وہ لوگ تو ہمارے ملک کی کنجیاں اٹھالے گئے (واللہ ذھبوا بمفاتیح ارضنا) البدایہ والنہایہ ۷/۴۳-۴۲

سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے حالات میں گھر کر سوچنا، دوسرا ہے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا۔ ایک ہے نفرت اور محبت جیسے جذبات کے تحت رائے قائم کرنا، دوسرا ہے نفرت اور محبت جیسے جذبات سے بلند ہو کر رائے قائم کرنا۔ عام طور پر لوگ حالات سے متاثر ہو کر سوچتے ہیں، وہ فوری جذبات کے زیر اثر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ مگر صحابہ کرام ان چیزوں سے اوپر تھے۔ وہ حالات اور جذباتی محرکات سے اوپر اٹھ کر خود اپنے فیصلہ کے تحت یہ طے کرتے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

صحابہ کی اس صفت نے ان کو بے پناہ حد تک طاقت ور بنا دیا تھا۔ انھیں مٹی دی جاتی اور وہ اس کو فتح کے تاج کی طرح قبول کر لیتے تھے۔ جس واقعہ کو لوگ بے عزتی کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں، اس سے وہ عزت کا مفہوم نکال لیتے تھے۔ جو تجربہ لوگوں کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے، اس سے وہ اپنے لیے یقین کی غذا حاصل کر لیتے تھے۔

صحابہ انسانی تاریخ کے وہ انوکھے افراد تھے جو عُسر میں یُسر کا راز پا لیتے تھے۔ جو ناکامی سے کامیابی کو نچوڑتے تھے۔ جو شکست کے واقعہ کو فتح کے واقعہ میں تبدیل کر دیتے تھے۔ جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی روشنی دیکھ لیتے تھے۔ رکھنے والا ان کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھتا تھا، اور وہ سمجھتے کہ اس نے خود ہی اپنا ملک ہمارے حوالے کر دیا ہے۔

بلند نظری

۱۷ھ کے آخر میں شام اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں طاعون کی وبا پھیلی۔ ۱۸ھ میں یہ وبا نہایت شدید ہوگئی۔ اس وقت شام کی مسلم فوجوں کے سپہ سالار ابو عبیدہ بن الجراح رضی تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ مسلمان جہاں ہیں وہیں ٹھہرے رہیں۔ حضرت ابو عبیدہ اس مرض میں مبتلا ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ان کے بعد معاذ بن جبل رض اس علاقہ کی مسلم فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ ان کی پالیسی بھی وہی رہی جو حضرت ابو عبیدہ کی پالیسی تھی۔ حضرت معاذ بن جبل اس مرض میں مبتلا ہوئے اور ان کا بھی اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔

اس کے بعد عمرو بن العاص رض اس علاقہ کی مسلم افواج کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی پالیسی بدلی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی موجودہ جگہ کو چھوڑ دیں۔ مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں :

فلما مات استخلف على الناس عمرو بن العاص فقام فيهم خطيبا فقال ۔ ايها الناس، إن هذا الوجع اذا وقع فانما يشتعل اشتعال النار فتحصنوا منه فى الجبال۔ فقال ابو وائل الهذلى۔ كذبت والله۔ لقد صحبت رسول الله صلى الله عليه وسلم وانت شر من حمارى هذا۔ فقال والله ما ارد عليك ما تقول

(البداية والنهاية ۷/۹۰)

پھر جب معاذ بن جبل رض کی وفات ہوگئی تو عمرو بن العاص لوگوں کے اوپر سردار مقرر ہوئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر لوگوں کے درمیان تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اے لوگوں، یہ بیماری جب آتی ہے تو وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ پس تم لوگ پہاڑوں میں اپنے آپ کو اس سے محفوظ کر لو۔ یہ سن کر ابو وائل ھذلی رض نے کہا کہ خدا کی قسم تم نے جھوٹ کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ اور تم میرے اس گدھے سے بھی زیادہ برے ہو۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ خدا کی قسم تم جو کہہ رہے ہو اس کا میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان کتنی سخت تنقیدوں کا رواج تھا۔ ان کے

یہاں اظہار رائے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لوگ نہ صرف آپس میں ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے بلکہ حاکموں اور سرداروں کے اوپر بھی آزادانہ تنقید کی جاسکتی تھی۔ اور نہ حاکم اس کو برا مانتا تھا اور نہ عام لوگ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کتنے زیادہ بڑے دل والے لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اتنی زیادہ بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ ——— جتنا بڑا دل، اتنی ہی بڑی کامیابی۔

اس دنیا میں خود تخلیقی فطرت کے تحت ایسا ہے کہ لوگوں کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ باصلاحیت ہو اتنا ہی زیادہ وہ منفرد انداز سے سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی طاقتور ٹیم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد میں تنقید کو برداشت کرنے کا مادہ ہو۔ خاص طور پر سربراہ کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ سخت ترین تنقید کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سنے۔ وہ اختلاف اور اتفاق سے اوپر اٹھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرے۔

جو لوگ اپنے اندر یہ صفت رکھتے ہوں، وہی اپنے گرد اعلیٰ انسانوں کی ٹیم جمع کر سکتے ہیں اور ان کو ساتھ لے کر کوئی بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت نہ ہو ان کے گرد صرف سطحی اور خود غرض اور منافق قسم کے لوگ جمع ہوں گے، اور سطحی اور خود غرض اور منافق قسم کے لوگوں کی جماعت اس دنیا میں کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتی۔

اصحاب رسول وہ بلند نظر اور اعلیٰ فطرت انسان تھے جن کو نہ تعریف خوش کرتی تھی اور نہ تنقید کو سن کر وہ برہم ہوتے تھے۔ خدا کو انھوں نے ایسی عظیم ترین حقیقت کے طور پر پایا تھا کہ اس کے بعد ان کے لیے ہر دوسری چیز چھوٹی ہوگئی تھی۔ وہ برتر خدا میں جینے والے لوگ تھے۔ اس لیے تنقید و اختلاف جیسی چیزیں ان کے ذہنی سکون کو برہم نہیں کرتی تھیں۔

اصحاب رسول کا ایک ایک شخص ہیرو تھا۔ مگر ان کی یہی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ سب مل کر ایک مستحکم دیوار بن گئے۔ ان کے ساتھ ہر قسم کی ناخوش گوار باتیں پیش آئیں، مگر وہ ان کے اتحاد کو توڑ نہ سکیں۔ وہ ان کے استحکام میں رخنہ ڈالنے والی ثابت نہیں ہوئیں۔ اس قسم کی تمام خرابیاں اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اور اختلاف کو پہلے ہی وہ اپنے لیے ایک ناقابل لحاظ چیز بنا چکے تھے۔

بے لاگ انصاف

اسلام کے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے :

علی بن ابی طالبؓ جب خلیفہ تھے، ایک روز وہ بازار کی طرف نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نصرانی وہاں ایک زرہ بیچ رہا ہے۔ حضرت علی نے پہچان لیا کہ یہ ان کی وہی زرہ ہے جو اس سے پہلے کھو گئی تھی۔ انھوں نے نصرانی سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ نصرانی نے انکار کیا۔ حضرت علی نے کہا کہ پھر مسلمانوں کے قاضی کے پاس چلو، وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔

اس وقت کوفہ میں مسلمانوں کے قاضی شُریح بن الحارث تھے۔ وہ ۷۷ھ تک اس عہدہ پر رہے۔ چنانچہ دونوں وہاں گئے۔ جب قاضی شریح نے امیر المومنین کو دیکھا تو وہ اپنے مقام سے اٹھ گئے اور حضرت علی کو اپنے مقام پر بٹھایا۔ اور قاضی شریح خود ان کے سامنے نصرانی کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

حضرت علی نے کہا کہ اے شریح، میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کرو۔ شریح نے کہا کہ اے امیر المومنین، آپ کیا کہتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے۔ کچھ دن پہلے وہ مجھ سے کھو گئی تھی۔ پھر قاضی شریح نے نصرانی سے کہا کہ تم کیا کہتے ہو۔ نصرانی نے کہا کہ امیر المومنین جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ یہ زرہ میری زرہ ہے۔

قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا کہ کیا آپ کے پاس کوئی دلیل (بینہ) ہے۔ کیونکہ دلیل اور شہادت کے بغیر آپ زرہ کو اس کے ہاتھ سے نہیں لے سکتے۔ حضرت علی نے کہا کہ شریح نے سچ کہا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے دو گواہ پیش کیے۔ ایک اپنے لڑکے حسن کو، اور دوسرے اپنے غلام قنبر کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ حسن کے علاوہ کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی نے کہا کہ کیا تم حسن کی شہادت کو رد کرتے ہو۔ کیا تم کو یہ حدیث نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسن اور حسین جنّت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

قاضی شریح نے کہا کہ قنبر کی گواہی میں قبول کرتا ہوں مگر حسن کی گواہی میں قبول نہیں کرسکتا۔

کیونکہ خود آپ سے میں نے یہ سنا ہے کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں۔ اس کے بعد حضرت علی نے قاضی شریح کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔

اس واقعہ کا نصرانی کے اوپر بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے امیر المومنین، یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ کے اونٹ سے وہ گر گئی تھی۔ پھر میں نے اس کو اٹھا لیا۔ پھر نصرانی نے کہا کہ اسلام کی یہ بات بہت عجیب ہے کہ امیر المومنین خود میرے ساتھ قاضی کے پاس آئے۔ قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرے اور وہ اس فیصلہ پر راضی ہو جائے۔

اس کے بعد نصرانی نے کلمۂ اسلام پڑھ کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ جب تم نے اسلام قبول کر لیا تو یہ زرہ اب تمہاری ہے۔ اسی کے ساتھ اس کو سات سو درہم اور ایک گھوڑا دیا۔ اس کے بعد وہ شخص حضرت علی کا ساتھی بن گیا۔ یہاں تک کہ جنگ صفین میں لڑتے ہوئے شہید ہوا (حیاۃ الصحابہ ۱/۳۵-۲۳۴)

قدیم زمانہ میں ہمیشہ حکمراں کو قانون سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ناقابل تصور تھا کہ ایک حکمراں کو عدالت میں معمولی انسان کی طرح کھڑا کیا جا سکے۔ موجودہ جمہوری زمانہ میں اگرچہ خالص قانونی اعتبار سے حکمراں اور عوام کو برابر سمجھا جاتا ہے۔ تاہم آج بھی عملی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ایک برسر اقتدار شخص کو عدالت میں بلایا جائے اور جج کی کرسی پر بیٹھنے والا آدمی عام انسانوں کی طرح اس کے اوپر قانون کا نفاذ کرے۔

پوری معلوم تاریخ میں یہ صرف اصحاب رسول ہیں جنھوں نے یہ استثنائی مثال قائم کی کہ ان کے ایک حاکم کو عدالت میں لایا جائے اور ایک عام انسان کی طرح مقدمہ چلا کر اس کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ ہر آدمی یکساں طور پر قانون کے سامنے جواب دہ ہو۔ مگر انسانی ضمیر کی یہ طلب حقیقی معنوں میں صرف ایک ہی دور میں عملی واقعہ بن سکی، اور وہ بلاشبہہ اصحاب رسول کا دور ہے۔

بادشاہ پر یکساں انصاف کی بات اصحاب رسول سے پہلے صرف افسانہ کی کتابوں میں تھی۔ اصحاب رسول نے اس کو افسانہ سے اٹھا کر حقیقی زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

سیاسی بے غرضی

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کے بعد مسلمانوں کا امیر کون ہو۔ اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ مہاجرین اور انصار۔ انصار کا خیال تھا کہ امارت ان کا حق ہے۔ کیونکہ رسول اور مہاجر صحابہ کو جب مکہ چھوڑنا پڑا تو انصار نے اس پورے قافلہ کو اپنے شہر مدینہ میں جگہ دی۔ وہ ہر اعتبار سے ان کے مددگار بن گئے۔ ان کی حیثیت اس وقت اگرچہ ایک "لٹے ہوئے قافلہ" کی تھی مگر انصار نے ان کی عزت اور احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔ انصار کی مسلسل حمایت اور قربانی کے ذریعہ اسلام مضبوط ہوا اور اس کی شاندار تاریخ بنی۔ ان اسباب کی بنا پر انصار کا یہ خیال تھا کہ امارت ان کا حق ہے۔ انصار کے لوگ اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے اپنے قبیلہ کی چوپال (سقیفہ بنی ساعدہ) میں جمع ہوئے۔

یہاں تک معاملہ پہنچ چکا تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین کو خبر ہوئی۔ وہ فوراً سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ کیونکہ اس معاملہ میں معمولی غفلت بھی نہایت دور رس نتیجہ پیدا کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ انصار کا یہ خیال درست تھا کہ ان کو مخصوص فضیلتیں حاصل ہیں۔ مگر دینی فضیلت ایک الگ چیز ہے اور سیاسی قیادت اس سے مختلف دوسری چیز۔ دینی فضیلت کسی بھی شخص کے اندر ہو سکتی ہے۔ مگر سیاسی قیادت صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے حق میں قیادت کے تاریخی اسباب جمع ہوئے ہوں۔

حضرت ابوبکر سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ تو وہاں انصار کے بزرگ قائد سعد بن عبادہ بھی موجود تھے۔ حاضرین کا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو امیر المومنین بنایا جائے۔ حضرت ابوبکر نے سعد بن عبادہ سے کہا کہ کیا تم کو یاد نہیں کہ تمہاری موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ: قریش ولاۃ ھذا الامر۔ اور الناس تبع لقریش۔ یعنی عرب میں سیاسی سرداری صرف قریش ہی کر سکتے ہیں۔ عرب کے لوگ ان کے سوا کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ حضرت ابوبکر نے انصار سے کہا کہ تمہاری دینی خدمت اور اسلام کے اندر تمہارا مقام مسلّم ہے۔ لیکن عرب کے لوگ قریش کی قیادت کے سوا کسی اور کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد تمام انصار اس پر راضی ہو گئے کہ

مہاجرین (قریش) میں سے کسی شخص کو امیر بنایا جائے۔یہ ایک بے حد انقلابی فیصلہ تھا جس کی معلوم انسانی تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

انصار پہلے اس معاملہ کو صرف "مدینہ" کے حالات کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، اب انھوں نے اس معاملہ کو پورے ملک کے نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ ان کے بے لاگ ذہن اور حقیقت پسندانہ مزاج نے انھیں بتایا کہ مدینہ میں اگرچہ مقامی طور پر انصار کو سیادت حاصل ہے مگر وسیع تر سطح پر پورا عرب کسی قریشی سردار ہی کی سرداری قبول کر سکتا ہے۔ انصار نے اس معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ یا سیاسی حق تلفی کا مسئلہ نہیں بنایا۔چنانچہ انھوں نے فوراً حضرت ابوبکر کی تجویز کو مان لیا۔

عرب میں اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا اس میں بلاشبہہ انصار کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس میں ان کی عظیم قربانیاں شامل تھیں۔ ایسی حالت میں یہ عین فطری تھا کہ غلبہ حاصل ہونے کے بعد انصار یہ چاہیں کہ امیر المومنین کا عہدہ ان کے پاس ہو یا کم از کم اقتدار میں قابلِ لحاظ حد تک انھیں شریک کیا جائے۔ چنانچہ ایک انصاری نے جب دیکھا کہ امیر کا عہدہ انصار کو دینے پر اختلاف ہے تو اس نے کہا کہ ایک امیر تم میں سے ہو اور ایک امیر ہم میں سے (منا امیر و منکم امیر) مگر وسیع تر مصالح کو جاننے کے بعد تمام انصار مہاجرین (قریش) کی امارت پر راضی ہو گئے۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ سیاسی قیادت کا عہدہ یک طرفہ طور پر مہاجرین کو دے دیا جائے، اور انصار کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

کسی نظام کو چلانے کے لیے اس قربانی کی بے حد اہمیت ہے۔ مگر یہ قربانی صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جو اپنے اندر سیاسی بے غرضی کی صفت رکھتے ہوں۔ انصار نے اس نادر صفت کا ثبوت دیا۔ اگر ان کے اندر سیاسی بے غرضی کی یہ غیر معمولی صفت نہ ہوتی تو پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد انصار اور مہاجرین میں ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔ اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ہی مدینہ میں دفن ہو جاتی۔ مگر انصار نے اپنے سیاسی حق سے یک طرفہ طور پر دستبردار ہو کر اسلام کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔

تحریک اپنے آغاز میں ہو تو اس میں عہدہ کی کشش نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ کامیابی کے مرحلہ میں پہنچتی ہے تو اس میں عہدہ اور اقتدار کی کشش شامل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر تحریک میں کامیابی کے بعد مناصب کی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ اصحاب رسول تاریخ کے پہلے گروہ ہیں جو عظیم کامیابی کے مرحلہ تک پہنچے مگر انھوں نے مناصب کو دوسروں کے حوالے کر کے اپنے لیے بے منصب حیثیت قبول کر لی۔

حکومت کے باوجود

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے (تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوّا فى الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين) القصص ۸۳

اس طرح کی آیتیں اور احکام قرآن میں بہت ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ زمین میں بڑا کون بنتا ہے اور کون ہے جو زمین میں فساد کرتا ہے۔ اگرچہ ایک عام انسان بھی اپنے دائرہ میں علو اور فساد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر یہ کام زیادہ بڑے پیمانہ پر وہ لوگ کرتے ہیں جن کو زمین میں اقتدار ملا ہوا ہو۔ جن کو وہ اختیار حاصل ہو جس کے بل پر کوئی شخص زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے۔

اس اعتبار سے صحابہ کرام کا گروہ تاریخ کا واحد گروہ ہے جو اس مطلوب انسانی قدر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اقتدار ملا، مگر اقتدار نے ان کے اندر گھمنڈ پیدا نہیں کیا۔ ان کو زمین میں بڑائی ملی، مگر انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح دنیا میں زندگی گزاری۔ وہ اعلیٰ اختیارات کے مالک تھے، مگر اختیار پانے کے باوجود وہ مفسد اور ظالم نہیں بنے۔ یہاں خلیفہ دوم عمر فاروق کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو اس معاملہ میں ایک علامتی مثال کی حیثیت رکھتا ہے:

عن الفضل بن عميرة، انّ الاحنف بن قيس قدم على عمر بن الخطاب فى وفد من العراق۔ قدموا عليه فى يوم صائف شديد الحر وهو محتجز بعباءة يهنأ بعيرا من ابل الصدقة۔ فقال: يا احنف ضع ثيابك وهلمّ فأعن امير المومنين على هذا البعير فانه لمن ابل الصدقة، فيه حق لليتيم والمسكين والارملة۔ فقال رجل من القوم۔ يغفر الله لك يا امير المومنين، فهلا تأمر عبدا من عبيد الصدقة فيكفيك هذا۔ قال عمر: وأىّ عبد هو أعبد منى۔ (تاریخ عمر بن الخطاب، لابن الجوزی، صفحہ ۷۱)

فضل بن عمیرہ کہتے ہیں کہ احنف بن قیس ایک عراقی وفد کے ساتھ عمر بن الخطاب کے پاس مدینہ آئے۔ وہ گرمی کے موسم میں آئے تھے جب کہ گرمی بہت سخت تھی۔ عمر اپنی کمر پر ایک چغہ باندھے ہوئے تھے۔ اور ایک

اونٹ کی مالش کر رہے تھے جو کہ بیت المال کا اونٹ تھا۔ انھوں نے کہا کہ اے احنف، اپنے کپڑے اتار دو اور اس اونٹ کے معاملہ میں امیر المومنین کی مدد کرو، کیونکہ یہ بیت المال کا اونٹ ہے۔ اس میں یتیم اور مسکین اور بیواؤں کا حصہ ہے۔ لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ آپ کو معاف کرے اے امیر المومنین، کیوں نہیں آپ نے بیت المال کے غلاموں میں سے کسی غلام کو حکم دے دیا، وہ آپ کی طرف سے اس کام کو انجام دے دیتا۔ عمر نے جواب دیا : مجھ سے زیادہ غلام کون ہے۔

اقتدار پانے کے بعد آدمی بگڑ جاتا ہے۔ یہ مظہر اتنا عام ہے کہ لارڈ ایکٹن (۱۹۰۲-۱۸۳۴) کا یہ قول ضرب المثل بن گیا ہے کہ اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے :

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely.

مگر تاریخ میں گروہ کے اعتبار سے صحابہ کرام کی مثال ایک استثنائی مثال ہے کہ ان کو زمین پر اقتدار ملا، لیکن اقتدار ان کو بگاڑنے والا نہ بن سکا۔ انھیں لوگوں کے اوپر حکومت حاصل تھی، مگر وہ محکوموں میں سے ایک محکوم بن کر لوگوں کے درمیان رہے۔ صحابہ کے دور میں خلیفہ اور امراء اور حکام کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

صحابہ کرام تاریخ کی واحد مثال بن گئے جن کے حوالہ سے حکمرانوں کو سادہ اور معمولی زندگی گزارنے کی تلقین کی جائے۔ ۱۹۳۷ میں پہلی بار ہندستان میں کانگرس کی وزارت بنی تو مہاتما گاندھی نے اپنے انگریزی اخبار میں کانگریسی وزیروں کو سادہ زندگی کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ میں آپ لوگوں کے سامنے رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ تاریخی شخصیتیں نہیں ہیں۔ میں مجبور ہوں کہ سادگی کے نمونہ کے لیے ابوبکر اور عمر کا نام پیش کروں۔ وہ اگرچہ بہت بڑی سلطنت کے مالک تھے مگر انھوں نے مفلسوں کی طرح زندگی گزاری (ہریجن ، ۲۷ جولائی ۱۹۳۷)

حکومت و اقتدار کے باوجود معمولی زندگی گزارنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ تمام مشکل کاموں میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس معیار پر وہ لوگ پورے اترتے ہیں جن کے لیے عہدہ اعزاز کی چیز نہ ہو بلکہ ذمہ داری کی چیز ہو۔ جو زندگی کے ذرائع کو سامان راحت نہیں بلکہ سامان آزمائش سمجھتے ہوں۔ جو اپنے نفس کی خواہش پر چلنے کے بجائے اپنے ایمانی شعور کے تحت عمل کرتے ہوں۔ صحابہ کرام وہ ربانی لوگ تھے جنھوں نے اس مشکل طریقہ کو اس کی تمام مشکلوں کے باوجود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔

معاہدہ کی پابندی

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب دوسری قوم سے تمہارا کوئی معاہدہ ہو تو تم اس معاہدہ پر قائم رہو۔ ایسا نہ کرو کہ اوپر اوپر معاہدہ کی حالت باقی رکھو اور اندر سے خفیہ طور پر اسے توڑ دو۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم کو کسی قوم سے بدعہدی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو، ایسی طرح کہ تم اور وہ دونوں برابر ہو جائیں۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا (الانفال ۵۸)

یعنی تم کو دشمن کے خلاف جو کارروائی کرنا ہے، معاہدہ کو بالاعلان توڑنے کے بعد کرو نہ کہ معاہدہ کو باقی رکھتے ہوئے۔ اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے دورِ صحابہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ کچھ لفظی فرق کے ساتھ احمد، الترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ تینوں روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں ہم اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں:

سُلیم بن عامر کہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور رومی حکومت کے درمیان ایک میعادی عہد نامہ تھا۔ معاویہ اپنی فوج کو لے کر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ سرحد کے قریب جاکر ٹھہریں اور اچانک ان کے اوپر حملہ کر دیں، معاویہ جب سرحد پر پہنچے تو ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر ظاہر ہوا اور بلند آواز سے کہنے لگا کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اسلام میں عہد کو پورا کرنا ہے، عہد کو توڑنا نہیں ہے (اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وفاء لا غدر)

لوگوں نے دیکھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عَمرو بن عنبسہ تھے۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے ان کو اپنے خیمہ میں بلایا۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو وہ نہ اس کی کوئی گرہ باندھے اور نہ اس کی کوئی گرہ کھولے، یہاں تک کہ اس کی مدت پوری ہو جائے۔ یا پھر وہ عہد کو برابری کے ساتھ اس کی طرف پھینک دے (مَن کان بینہ وبین قوم عھد فلا یشدّ عقدۃ ولا یحلّھا حتی ینقضی امدُھا او ینبذ الیھم علی سواء) تفسیر ابن کثیر ۲/۳۲۰، الجامع لاحکام القرآن ۸/۳۲

اس وقت امیر معاویہؓ سرحدِ روم پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور اگلی صبح کو حملہ کرنے والے تھے۔ مگر اس انتباہ کے بعد وہ حملہ سے رک گئے اور اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا (قال: فرجع

معاویۃ بالناس) مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۱۱۶۵

بین اقوامی دنیا میں ہمیشہ سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ جس قوم سے دشمنی ہو جاتی تھی، اس کے بارہ میں لوگ کسی اخلاقی اصول کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ حتی کہ ایسی قوم سے بظاہر امن اور صلح کا معاہدہ کرنے کے باوجود اندر اندر اس کے خلاف کارروائی جاری رکھتے تھے۔

اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو جو نمونہ قائم کرنا تھا، اس میں یہ بھی شامل تھا کہ بین اقوامی تعلقات میں اخلاقی اصولوں کو پوری طرح نبھایا جائے۔ مثلاً کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس معاہدہ کی آخری حد تک پابندی کی جائے۔ اور اگر اس قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تب بھی کوئی کارروائی صرف اس وقت کی جائے جب کہ اس قوم کو اس سے مطلع کر دیا جائے۔ تاکہ معاہدہ کے دوسرے فریق کو بخوبی طور پر معلوم ہو جائے کہ اب دونوں کے درمیان سابقہ حالت باقی نہیں ہے۔

یہ بلاشبہ ایک بے حد اہم اصول تھا۔ مگر اس کو عملی طور پر قائم کرنے کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ خود اپنے مفاد کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کو پیشگی طور پر بتا دیا جائے کہ تمہارے ساتھ امن کی حالت ختم ہو چکی ہے اور اب ہم تمہارے اوپر حملہ کرنے والے ہیں تو ایسی حالت میں دشمن چوکنا ہو جائے گا۔ وہ تیاری کر کے سخت مقابلہ کرے گا۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا اقدام ہمارے لیے الٹا ثابت ہو جائے۔

اس صورت حال میں اس بین اقوامی اصول کو عملاً قائم کرنے کے لیے ایک بے حد با اصول قوم درکار تھی۔ جو ہر دوسرے پہلو کو نظر انداز کر کے اصول کو اعلیٰ ترین حیثیت دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ جو ہر نقصان کو گوارا کرے مگر اصول کی خلاف ورزی گوارا نہ کرے۔

مذکورہ واقعہ ایک مثال ہے جو بتاتا ہے کہ اصحاب رسول نے اس حوصلہ کا ثبوت دیا۔ وہ اس کے لیے مطلوبہ قربانی دینے پر راضی ہو گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ تاریخ میں پہلی بار بین اقوامی تعلقات میں یہ اصول عملاً قائم ہوا کہ دو قوموں میں بگاڑ اور عناد ہو تب بھی اخلاقی روایات کو نہ توڑا جائے۔ دشمن سے مقابلہ میں بھی سچائی اور شرافت کے خلاف عمل نہ کیا جائے۔

ہر اصول کی ایک قیمت ہے۔ لوگ قیمت دینا نہیں چاہتے، اس لیے وہ اس پر عمل بھی نہیں کرتے۔ صحابہ نے ہر اصول کی مطلوبہ قیمت ادا کی، اسی لیے وہ ہر اصول پر عمل کرنے میں کامیاب رہے۔

تاریخ ساز

خلیفہ چہارم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ اسلامی تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔ امام جمال الدین ابوالفرج بن الجوزی (م ۵۹۷ ھ) نے اپنی کتاب تاریخ عمر بن الخطاب میں اس واقعہ کو نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم عُمر بن الخطاب کے پاس تھے کہ ان کے یہاں اہل مصر کا ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ اے امیرالمومنین، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے۔ مصری نے کہا کہ مصر کے حاکم عَمرو بن العاص نے مصر میں گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس میں ایک گھوڑا بڑھ گیا جو میرا تھا۔ پھر جب لوگ آ آکر میرے گھوڑے کو دیکھنے لگے تو عمرو بن العاص کے لڑکے محمد اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میرا گھوڑا بڑھ گیا۔ جب وہ میرے قریب آئے اور میں نے ان کو پہچانا تو میں نے کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میرا گھوڑا۔ اس پر محمد بن عمرو یہ کہتے ہوئے مجھے کوڑے سے مارنے لگے کہ یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں (خذها، خذها، وانا ابن الاکرمین)

راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، عُمر نے اس کے سوا اور کچھ نہ کیا کہ انھوں نے مصری سے کہا کہ بیٹھو۔ پھر انھوں نے عَمرو بن العاص کے نام خط لکھا کہ جب تم کو میرا یہ خط پہنچے تو تم فوراً مدینہ آجاؤ اور اپنے ساتھ اپنے لڑکے محمد کو بھی لے آؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ جب خط پہنچا تو عمرو بن العاص نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ کیا تم سے کوئی بات سرزد ہوئی ہے، کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے۔ محمد نے کہا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ عمر تمہارے بارہ میں ایسا لکھ رہے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر دونوں چل کر عمر کے پاس آئے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، اس وقت ہم لوگ عمر کے پاس منیٰ میں تھے کہ اتنے میں عمرو بن العاص آئے۔ ان کے جسم پر ایک ازار اور ایک چادر تھی۔ پھر عمر ان کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ان کے لڑکے کو دیکھیں، تو وہ اپنے باپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ عمر نے کہا کہ مصری کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں یہ ہوں۔ عمر نے کہا کہ یہ کوڑا لو، شریف زادہ کو مارو، شریف زادہ کو مارو۔ راوی کہتے ہیں کہ مصری نے ان کو مارا یہاں تک کہ ان کو خون آلود کر دیا (فضربه حتى اثخنه)

پھر عمرؓ نے کہا کہ عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو۔ کیوں کہ خدا کی قسم، ان کے لڑکے نے انھیں کی بڑائی کے بل پر تم کو مارا تھا۔ مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مار لیا۔ عمر نے کہا کہ خدا کی قسم، اگر تم ان کو مارتے تو ہم تمہارے اور ان کے بیچ میں حائل نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر انھوں نے عمرو بن العاص سے کہا کہ اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا (یا عمرو، متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا)

اس کے بعد عمرؓ مصری کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اطمینان کے ساتھ واپس جاؤ۔ اگر تمہارے خلاف پھر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھو (انصرف راشدا فان رابك ريب فاكتب الي) ابوالفرج بن الجوزی، تاریخ عمر بن الخطاب، مطبعۃ التوفیق الادبیۃ، القاہرہ صفحہ ۹۹ — ۱۰۰

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ساری انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خدا کے دین کی تاریخ بنائی۔ صحابہ سے پہلے خدا کے دین کی حیثیت ایک فکری تحریک کی تھی، صحابہ کے بعد خدا کے دین کی حیثیت ایک حقیقی اور عملی تاریخ کی ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ اس کے دین کی پشت پر ایک تاریخی نمونہ قائم ہو جائے۔ مگر یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ دینی افکار کی بنیاد پر ایک عالمی انقلاب برپا ہو۔ اس قسم کے ایک دور رس انقلاب کے بغیر مذکورہ قسم کا واقعہ تاریخ کے صفحات میں لکھا نہیں جا سکتا۔

مذکورہ واقعہ بلاشبہہ خدائی انصاف اور انسانی مساوات کی عظیم الشان مثال ہے مگر اس مثال کو ظہور میں لانے کے لیے بے پناہ قربانیوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ ہمہ گیر انقلاب لایا جائے جو رسولؐ کی قیادت میں صحابۂ کرام لے آئے۔ پھر اس کے لیے ضرورت تھی کہ سماج میں صحابہ جیسے مثالی انسانوں کا غلبہ قائم ہو۔ پھر اس کے لیے ضروری تھا کہ جو خلیفہ ایک حاکم کے بیٹے کے جرم پر اس کو کوڑا مارنے کا حکم دے رہا ہے وہ خود اپنے بیٹے کے جرم پر اسی طرح اس کو کوڑا مار چکا ہو۔

اصحاب رسول نے یہ ساری مہنگی قیمت ادا کی۔ وہ اپنی ذات کے لیے جینے کے بجائے خدا کے دین کے لیے جئے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ان کے ذریعہ سے خدا کے دین کی مطلوب عملی تاریخ بنے۔

بہتر حکمراں

افلاطون (۳۴۸-۴۲۸ ق م) قدیم یونان کے تین بڑے فلسفیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے دو فلسفی سقراط اور ارسطو ہیں۔ اس کی ایک مشہور کتاب "ریپبلک" ہے۔ یہ آئیڈیل ریاست سے بحث کرتی ہے اور مکالمات کی صورت میں ہے۔ اچھے حکمراں کیسے بنتے ہیں، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے افلاطون نے جو بات کہی ہے، اس کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح کیا گیا ہے :

(Unless philosophers bear kingly rule... or those who are now called kings and princes become genuine and adequate philosophers, there will be no respite from evil.

جب تک فلاسفہ بادشاہت کا عہدہ نہ سنبھالیں، یا جو لوگ آج بادشاہ اور شہزادے کہے جاتے ہیں وہ واقعی فلسفی نہ ہو جائیں، اس وقت تک برے بادشاہوں سے نجات ملنے والی نہیں۔

افلاطون کے اس نظریہ کے بعد ایسے متعدد افراد حکمراں ہوئے ہیں جن کو فلسفی بادشاہ (philosopher-king) کہا جاتا ہے۔ مثلاً رومی بادشاہ مارکس اریلیس (Marcus Aurelius) روس کی ملکہ کیتھرین دوم (Catherine II) پروشیا کا فریڈرک دوم (Frederick II) مقدونیہ کا ڈیمٹریس (Demetrius) اور عہد حاضر میں سنگاپور کا لی کوان ایو (Lee Kuan Yew) فلسفی حکمراں تھے۔ مگر وہ بہتر حکمراں ثابت نہ ہو سکے۔

خود یونانی فلسفیوں کے کچھ شاگرد بادشاہ کے عہدے تک پہنچے۔ مثلاً ارسطو اسکندر رومی کا معلم تھا۔ اسی طرح ڈیمیٹریس ارسطو کے مدرسۂ فلسفہ کا تربیت یافتہ تھا۔ مگر یہ فلسفی حکمراں دوسروں سے بہتر حکمراں ثابت نہ ہو سکے۔ پیٹر گرین (Peter Green) کے الفاظ میں، جو ہوا وہ یہ تھا کہ کچھ نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار فلسفیوں کو بھی بگاڑ دیتا ہے :

What happened was, nothing happened... Power, it appeared, could corrupt even philosophers (*Time* magazine, May 13, 1991).

کارل مارکس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ ملکیت کا اقتصادی نظام ہے۔ انفرادی ملکیت کے نظام میں ایک مالک ہوتا ہے اور دوسرا مملوک۔ اس بنا پر جو مالک ہے وہ مملوک کا

استحصال کرتا ہے۔ اگر انفرادی ملکیت کے نظام کو ختم کر کے "سب کی ملکیت" کا نظام قائم کر دیا جائے تو ہر قسم کے ظلم و جبر کی جڑ کٹ جائے۔ اس کے بعد نہ کوئی مالک ہوگا اور نہ کوئی مملوک، پھر کون کس کا استحصال کرے گا۔ کون کس کے اوپر ظلم کرے گا۔

۱۹۱۷ میں روس میں مارکسی انقلاب آیا اور مذکورہ قسم کا بے ملکیتی نظام بزور قائم کر دیا گیا مگر بعد کے حالات نے بتایا کہ مارکس کا تجویز کیا ہوا بے ملکیتی نظام تاریخ کا سب سے زیادہ ظالمانہ نظام تھا۔ اور وہاں کے حکمراں تمام حکمرانوں سے زیادہ جابر اور متشدد۔ نام نہاد اجتماعی ملکیت کے نظام نے ظلم و جبر میں مزید اضافہ کر دیا۔

اسی طرح بیسویں صدی کے نصف اول میں ایشیا اور افریقہ میں بہت بڑے پیمانہ پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے علم برداروں کا کہنا تھا کہ تمام ظلم و فساد کا سبب بدیشی راج ہے۔ اگر ملک میں دیش کے لوگوں کا راج قائم کر دیا جائے تو ظالمانہ حکمرانی کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔ قومی آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہوئی اور ہر ملک میں خود ملک کے افراد حکومت کے عہدوں کے مالک ہو گئے۔ مگر ظلم و جبر کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ ملکی افراد بدستور ظالم حکمراں بنے رہے۔ جو ظلم پہلے بدیشیوں کے ہاتھ سے ہوتا تھا، وہ اب دیش والوں کے ہاتھ سے ہونے لگا۔

خدا کا دین (اسلام) مذکورہ قسم کے تمام دعووں کو غلط بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر حقیقی اصلاح صرف ایک چیز سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ اللہ کا خوف ہے۔ اللہ کے ڈر کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک با اقتدار انسان کو عدل اور حق کے معیار پر قائم رکھ سکے۔

صحابہ سے پہلے یہ دعویٰ، عام انسان کی نظر میں، صرف ایک دعویٰ تھا۔ کیوں کہ خالص تاریخی اعتبار سے وہ ثابت شدہ نہیں بنا تھا۔ ان سے پہلے مدوّن تاریخ میں کوئی ایسی معلوم مثال نہ تھی جو اس نظریہ کو واقعاتی طور پر ثابت کرتی ہو۔

صحابہ نے اس نظریہ کے حق میں واقعاتی مثال قائم کی۔ ان کو اقتدار ملا، مگر وہ اُس بگاڑ سے محفوظ رہے جس میں ہر دور کے حکمراں مبتلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک دعویٰ ہے اور اصحاب رسول اس کی دلیل۔ اسلام ایک نظریہ ہے اور اصحاب رسول اس نظریہ کے حق میں عملی تصدیق۔

نئے دور کے نقیب

خلیفہ دوم عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ مسلمانوں کی مسلح فوجوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔

اس زمانہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایرانی بادشاہ یزدگرد کی ہدایت پر اس کے سپہ سالار رستم نے حضرت سعد کو یہ پیغام بھیجا کہ صلح کی بات چیت کے لیے اپنے آدمیوں کا ایک وفد بھیجیے۔ اس دوران جو لوگ ایرانی حکمرانوں سے بات کرنے کے لیے ان کے یہاں گئے، ان میں سے ایک حضرت ربعی بن عامر تھے۔

ربعی بن عامر رستم کے دربار میں پہنچے۔ اس نے اپنے دربار کو نہایت شاندار طور پر سجایا تھا۔ قیمتی قالین، عالی شان تخت، سونا چاندی اور ہیرے اور جواہر کے آرائشی سامانوں سے وسیع خیمہ جگمگا رہا تھا۔ رستم اپنے سر پر سنہری تاج پہنے ہوئے اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

ربعی بن عامر کے جسم پر نہایت معمولی کپڑا تھا۔ وہ ایک تلوار لٹکائے ہوئے اور ایک چھوٹے گھوڑے پر سوار ہو کر اندر داخل ہوئے۔ وہ گھوڑے سے اترے نہیں، یہاں تک کہ وہ رستم کے تخت تک پہنچ گئے۔ تخت کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترے اور قالین میں اپنا نیزہ گاڑ کر اس سے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ رستم کے آدمیوں نے اس بے باکانہ انداز پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں خود سے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ تمہارے بلانے پر آیا ہوں۔ اگر تم مجھ کو میرے حال پر رہنے دو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔

رستم نے اپنے آدمیوں کو روکا اور کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، ان سے تعرض نہ کرو۔ رستم نے مختلف سوالات کیے جس کا انھوں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ رستم کے ایک سوال کا جواب انھوں نے ان الفاظ میں دیا :

قال : اللهُ ابتعثنا لِنخرجَ مَن شاءَ مِن عبادةِ العباد الى عبادة الله۔ و مِن ضيق الدنيا إلى سعتها	انھوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ اللہ کے بندوں میں سے جس کو وہ چاہے ہم اس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت

ومن جور الادیان الی عدل الاسلام۔ فارسلنا بدینہ الی خلقہ لندعوھم الیہ۔ فمن قبل ذلک قبلنا منہ ورجعنا عنہ۔ ومن ابی قاتلناہ ابدا حتی نفضی الی موعود اللہ (البدایۃ والنہایۃ ۷/۳۹)

کی طرف لے آئیں، اور دنیا کی تنگی سے دنیا کی وسعت کی طرف، اور مذہبوں کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف۔ پس اللہ نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔ پس جو اس کو قبول کرلے ہم بھی اس سے قبول کرلیں گے اور اس سے واپس چلے جائیں گے۔ اور جو کوئی انکار کرے اس سے ہم لڑیں گے، یہاں تک کہ اس کو اللہ کے وعدہ تک پہنچا دیں۔

صحابی کے یہ الفاظ کوئی سادہ الفاظ نہ تھے۔ اس میں دراصل اس عظیم انقلاب کی طرف اشارہ تھا جو اصحاب رسول کے ذریعہ لایا گیا اور جس نے عالمی سطح پر انسانی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی صورت حال یہ تھی کہ ساری دنیا میں نسلی بادشاہت کا رواج تھا۔ اس بادشاہت نے ہر جگہ جبر کی وہ فضا پیدا کر رکھی تھی جس کو ہنری پرین نے شاہانہ مطلقیت (imperial absolutism) کہا ہے۔ ایک شخص جس کے سر پر حکومت کا تاج ہو وہ سب کا آقا تھا، اور تمام لوگ اس کے غلام۔

مشرکانہ مذہب اور مطلق شہنشاہیت دونوں نے مل کر فطرت کے سائنسی مطالعہ کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فطرت میں چھپی ہوئی خدا کی تمام نعمتیں بے دریافت اور غیر استعمال شدہ بنی ہوئی تھیں۔

مذہب میں مذہبی پیشواؤں کا مکمل قبضہ تھا۔ وہ دنیا میں خدا کے نمائندہ بن کر انسانوں کو اپنا بندہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کے گھڑے ہوئے مصنوعی مذہب کے نیچے پوری انسانیت پس رہی تھی۔ اس پیشوائی نظام سے اختلاف کرنے والے کو سخت ترین سزا دی جاتی تھی تاکہ لوگ دبے رہیں اور اس سے بغاوت کی جرأت نہ کرسکیں۔ اللہ کو مطلوب تھا کہ اس حالت کو بدلا جائے۔ اصحاب رسول نے غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ جبر کے اس نظام کو توڑا۔ انھوں نے انسان کے اوپر خدائی رحمتوں کا وہ دروازہ کھول دیا جو ہزاروں سال سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

نمونۂ انسانیت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی تم پیروی کروگے تم ہدایت پا جاؤ گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اسلام کا نمونہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہم جان سکتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی رضا کو پانے کے لیے اس دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ ایک تابعی نے اسی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا : والقدوۃ ھم ۔ یعنی صحابہ ہی تو نمونہ ہیں۔

ایمان کیا ہے اور مومن کسے کہتے ہیں، اس کا نہایت واضح بیان قرآن میں موجود ہے۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مزید یہ اہتمام فرمایا کہ سچے ایمان کا عملی نمونہ دنیا میں قائم کر دیا۔ یہ عملی نمونہ اسی انسانی گروہ کے ذریعہ قائم کیا گیا ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول کے ایمان و اسلام کو قبول کیا اور اس کی تصدیق فرمائی۔ اس طرح اس نے عمل کی زبان میں تمام انسانوں کو بتا دیا کہ اس کو کون سا ایمان واسلام مطلوب ہے۔

اس نمونہ کے سامنے آنے کے بعد اب ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کو اصحاب رسول کے ایمان سے ملا کر دیکھے۔ اگر اس کا ایمان اصحاب رسول کے نمونہ کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر وہ اس نمونہ کے مطابق نہیں ہے تو وہ خدا کے یہاں قبول کیے جانے کے لائق نہیں۔

اصحاب رسول کی یہ حیثیت کہ وہ تمام انسانی نسلوں کے لیے "ستارہ" قرار دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ ان سے روشنی حاصل کریں، یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول نے وہ انتہائی مہنگی قیمت ادا کی جو کسی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ستارۂ ہدایت بنے۔ اس قیمت کی ادائیگی کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ان کے حق میں یہ اعلان کیا جائے کہ وہ تمام نسلوں کے لیے ستارۂ ہدایت ہیں، اور اب قیامت تک تمام لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان کے نمونہ سے روشنی لے کر اپنی زندگیوں کی تعمیر کریں۔

آج ایک شخص محمّد (قابل تعریف) پیغمبر پر ایمان لا کر مومن کہلاتا ہے، صحابہ کو مومن بننے کے لیے مذمّم (قابل مذمت) پیغمبر پر ایمان لانے کے امتحان میں کھڑا ہونا پڑا۔ آج ہم مذہبی آزادی کے

ماحول میں دیندار بنے ہوئے ہیں، انھیں مذہبی جبر کے ماحول میں دین کو اختیار کرنا پڑا۔ آج ہم ایک پُرفخر اسلامی تاریخ کے مالک ہیں، انھیں ایک ایسے اسلام سے وابستہ ہونا پڑا جس کی سرے سے کوئی تاریخ ہی نہ تھی۔

آج لوگوں کو اسلام کے نام پر بڑے بڑے اعزازات مل رہے ہیں، انھیں اسلام کی خاطر اپنے آپ کو بالکل بے قیمت کر دینا پڑا۔ آج اسلام کی علم برداری سے ہر جگہ لوگوں کو قیادت اور استقبال کا تحفہ حاصل ہو رہا ہے، انھیں ایک ایسے اسلام کا علمبردار بننا پڑا جس نے ان کی موجودہ عزت و رفعت کو بھی مٹی میں ملا دیا۔

صحابہ نے جس اسلام کو اختیار کیا اس کو اختیار کرنا اخلاص کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انھوں نے جس دین کو اپنا دین بنایا اس کا محرک اللہ کی رضا کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ان کا اسلام مکمل طور پر بے داغ اسلام تھا۔ ان کی للّٰہیت ہر امتحان میں پوری اتری تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کے وہ منتخب گروہ قرار پائے جس کی تقلید کی جائے۔ جس کے نمونہ کو ہمیشہ کے لیے اپنا رہنما بنا لیا جائے۔

جو لوگ معمول کے حالات میں اسلام کو اختیار کریں، وہ کبھی اسلام کا نمونہ نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو لوگ اس دور میں اسلام کا نام لیں جب کہ اسلام کا نام لینے سے قیادت ملتی ہے۔ اقتصادی فائدے حاصل ہوتے ہیں، اور سماج میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے، وہ بھی نمونہ بننے کے لائق نہیں۔ کیونکہ نمونہ کے لیے خالص جذبہ ضروری ہے۔

اسلام کا نمونہ صرف وہ لوگ بن سکتے ہیں جو غیر معمولی حالات میں اسلام پر قائم رہیں۔ جو اس دور میں اسلام کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کریں جب کہ اس کے ساتھ وابستگی کے بعد ملی ہوئی عزت بھی ختم ہو جائے۔ جب آدمی عوام کے درمیان اپنی مقبولیت کھو دے۔

اصحاب رسول اسی قسم کے غیر معمولی لوگ تھے جنھوں نے غیر معمولی حالات میں اسلام کا ساتھ دیا۔ انھوں نے کھونے کی قیمت پر اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ وابستہ کیا۔ وہ اعلیٰ انسانیت پر کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے معیاری قول و عمل کی بنا پر اس قابل ٹھہرے کہ وہ تمام قوموں اور تمام نسلوں کے لیے رول ماڈل ہوں۔ وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ابدی مثال بن جائیں۔

دنیا کے لیے رحمت

پیغمبروں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان کی مخاطب قوم اگر ان کو نہ مانے تو اس کو زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ پچھلے زمانوں میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی مخاطب قومیں اپنے انکار کے سبب سے بار بار ہلاک کی جاتی رہیں (العنکبوت ۴۰) آخر کار اللہ نے چاہا کہ ایک ایسا پیغمبر بھیجے جس کے بعد ہلاکت کا مذکورہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم یہی خاص پیغمبر تھے۔ اسی لیے قرآن میں آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت (الانبیاء ۱۰۷) کہا گیا ہے۔ اس آیت سے متعلق مفسرین کے کچھ اقوال یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

قوله تعالى (وما ارسلناك الا رحمة للعالمين) قال سعيد بن جبير عن ابن عباس قال : كان محمد صلى الله عليه وسلم رحمة لجميع الناس فمن آمن به وصدّق به سعد ومن لم يؤمن به سلم مما لحق الأمم من الخسف والغرق (الجامع لاحکام القرآن ۱۱/۳۵۰)

"اور ہم نے تم کو بس رحمت بنا کر بھیجا ہے" اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے رحمت تھے۔ جو آدمی آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی اس نے سعادت حاصل کی اور جو آدمی آپ پر ایمان نہیں لایا وہ زمین میں دھنسنے اور غرق ہونے کے اس عذاب سے بچ گیا جو دوسری قوموں کو پیش آیا۔

فان قيل فاىّ رحمة حصلت لمن كفر به۔ فالجواب ما رواه ابو جعفر بن جرير عن ابن عباس ، قال من آمن بالله واليوم الآخر كتب له الرحمة فى الدنيا والآخرة۔ ومن لم يؤمن بالله ورسوله عوفى مما اصاب الامم من الخسف والقذف (مختصر تفسیر ابن کثیر ۲/۵۲۵)

اگر یہ کہا جائے کہ اس کو کون سی رحمت ملی جس نے آپ کا انکار کیا۔ تو اس کا جواب وہ ہے جو ابن جریر نے عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو آدمی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اس کے لیے دنیا اور آخرت میں رحمت لکھ دی گئی۔ اور جو آدمی اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لایا وہ دھنسانے اور پتھراؤ کیے جانے کے اس عذاب سے بچ گیا جو پچھلی امتوں کو پیش آیا تھا۔

وقيل هو رحمة للمومنين فى الدارين وللكافرين فى الدنيا بتاخير عذاب الاستئصال والمسخ والخسف (تفسیر النسفی ۳/۹۱)

اور کہا گیا ہے کہ آپ اہل ایمان کے لیے دونوں عالموں میں رحمت ہیں۔ اور اہلِ انکار کے لیے دنیا میں رحمت، کیونکہ ان پر مہلک عذاب اور مسخ اور دھنسائے جانے کا عذاب ٹال دیا گیا۔

فكان رحمةً للعالمين حتى الكفار رُحموابه حيث اخّر عقوبتهم ولم يستأصلهم بالعذاب كالمسخ والخسف والغرق (صفوة التفاسير ۲/۲۷۰)

آپ منکرین تک کے لیے رحمت تھے۔ آپ کی وجہ سے ان کی سزا موخر ہوگئی اور ان پر عذاب مستاصل نہیں آیا، مثلاً مسخ، دھنسانا اور غرق کرنا۔

روى البخارى فى التاريخ عن ابى هريرة، قال: انما بعثت رحمة ولم ابعث عذابا۔ وقال ابن عباس: هو رحمة للكافر فى الدنيا بتأخير العذاب عليهم ورفع المسخ والخسف والاستئصال (التفسير المظهرى ۶/۲۴۴)

بخاری نے اپنی تاریخ میں ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں عذاب بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ اور عبد اللہ بن عباس نے کہا کہ آپ منکرین کے لیے دنیا میں ان پر عذاب ٹل جانے کی وجہ سے رحمت ہیں اور مسخ اور دھنسنا اور مہلک عذاب اٹھا لیے جانے کی وجہ سے۔

مگر دنیا میں "رسولِ رحمت" کا دور لانا سادہ طور پر محض تقرری (appointment) کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک طاقت ور انسانی ٹیم رسول رحمت کی کامل معاونت کرے اور اسباب وعلل کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مطلوبہ تاریخی انقلاب لے آئے۔ اصحاب رسول اپنے اعلیٰ شعور اور اپنی بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ یہی طاقت ور ٹیم بنے۔ انھوں نے رسول رحمت کے خدائی منصوبہ کو عملاً قائم کیا۔

قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا انسان کے لیے آزمائش گاہ ہے۔ یہاں انسان کو آزادی دے کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا عمل کرتا ہے اور کون برا عمل۔ انسان کے اسی ریکارڈ کے مطابق اس کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ خدا کے پیغمبر انسان کو اسی نوعیتِ حیات کی خبر دینے کے لیے آتے تھے۔ جب آخری رسول پر پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم کیا گیا تو اس کے بعد اللہ نے چاہا کہ دین پیغمبر کو ذاتِ پیغمبر کا بدل بنا دیا جائے۔ زندہ پیغمبر کے بجائے پیغمبر کا لایا ہوا ہدایت نامہ لوگوں کے لیے ہدایت کا

ذریعہ بن جائے۔

یہ صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ خدا کا دین ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ دین بن چکا ہو۔ پچھلے زمانوں میں ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ کیونکہ پیغمبروں کو انسانوں کی اتنی بڑی تعداد نہیں ملی جو دین کی حمایت کر کے عالم اسباب میں اس کی حفاظت کا انتظام کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اس کے بعد مٹایا جاتا رہا۔ آج پچھلے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کی تاریخ موجود نہیں، اور نہ کسی پیغمبر کی کتاب محفوظ حالت میں پائی جاتی ہے۔

اس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کو مجرد نظریہ کی سطح سے اٹھا کر اس کو عملی انقلاب کے درجہ تک پہنچا دیا جائے۔ اس کے لیے ضرورت تھی مخالفِ دین طاقتوں کا زور توڑ دیا جائے تاکہ وہ ماضی کی طرح اس دین کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کی پشت پر ایک طاقت ور امت کھڑی کر دی جائے جو تمام مخالفین کے علی الرغم اس کی محافظ اور امین بن سکے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کی بنیاد پر ایک مکمل تاریخ وجود میں آجائے تاکہ خدا کے دین کی پشت پر ایک عملی نمونہ موجود رہے جو ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کرتا رہے۔

یہ منصوبہ بلاشبہہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اصحاب رسول نے ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اس کو مکمل کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا وطن اور اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ دیا۔ قریش آپ کے دشمن ہو گئے۔ مگر صحابہ نے اپنے جان و مال کو لٹا کر پیغمبر کی مدد کی۔ حنین کی جنگ میں دشمنوں نے آپ پر تیروں کی بارش کر دی۔ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت نے آپ کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان کے جسموں پر تیر اس طرح لٹک رہے تھے جس طرح ساہی کے جسم پر کانٹے لٹکتے ہیں۔ مگر انھوں نے پیغمبر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ روم و ایران کی طاقتور سلطنتیں خدا کے دین کی دشمن ہو گئیں۔ صحابہ نے ان طاقتور چٹانوں کو توڑ ڈالا، وغیرہ۔

صحابہ کرام نے ہر قربانی کی قیمت پر پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنے بے پناہ عمل سے وہ تاریخی حالات پیدا کیے جس کے بعد سنت اللہ کے مطابق نبیوں کا سلسلہ ختم ہوا اور انسانیت بار بار دنیوی ہلاکت کے انجام سے بچ گئی۔ نبوت رحمت کا قیام ایک خدائی منصوبہ تھا، مگر یہ اصحاب رسول ہی تھے جنھوں نے عالم اسباب میں اس منصوبہ کو مکمل کیا۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔